علم التعلیم

12

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

فہرست عنوانات

صفحہ	عنوانات	باب
1	برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم	پہلا باب
1	تعارف	
3	مکتب ومدارس	
3	جامعات	
4	مسلم مفکرین کی تعلیمی خدمات	
4	الغزالیؒ	
7	ابن خلدون	
11	ابن سینا	
13	علامہ زرنوجی	
15	مسلمانوں کی آمد کے وقت برصغیر کی تعلیمی حالت	
15	برصغیر میں نظام تعلیم کے نمایاں پہلوؤں کا جائزہ	
16	مقاصد تعلیم	
17	نصاب تعلیم	
19	تدریسی طریقے	
21	مانیٹوریل سسٹم	
21	جائزہ	
22	نظم ونسق	
27	جنوبی ایشیا میں برطانوی نظام تعلیم	دوسرا باب
27	تعارف	
28	ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز	
29	چارٹر ایکٹ	
31	ووڈ ڈسپیچ	
32	سارجنٹ رپورٹ (1944)	
32	برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کی خصوصیات	
35	جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات	

36	تحریک دیوبند	
36	تحریک دیوبند کے اسباب	
37	تحریک دیوبند کی خصوصیات	
38	تحریک دیوبند پر تبصرہ	
39	تحریک علی گڑھ	
40	تحریک علی گڑھ کے مقاصد	
40	سرسید احمد خان کی تعلیمی خدمات	
42	تحریک علی گڑھ کے اثرات	
48	پاکستان کی تعلیمی پالیسیاں اور منصوبے	تیسرا باب
48	نظریہ پاکستان کا تعلیمی مفہوم	
49	قومی تعلیمی پالیسیاں	
49	مقاصد تعلیم	
50	تعلیمی کانفرنس 1947ء	
51	تعلیمی کانفرنس سے وزیر تعلیم کا خطاب	
51	تعلیمی کمیٹیوں کا قیام	
53	قومی تعلیمی کمیشن 1959ء	
54	قومی تعلیمی پالیسی 1970ء	
55	قومی تعلیمی پالیسی 80-1972ء	
56	قومی تعلیمی پالیسی 1979ء	
58	قومی تعلیمی پالیسی 1992ء	
59	قومی تعلیمی پالیسی 2010-1998ء	
66	پاکستان کے تعلیمی مسائل	چوتھا باب
66	ناخواندگی	
67	پاکستان میں ناخواندگی کی وجوہات	
68	تعلیم نسواں	
69	تعلیم نسواں میں کمی کی وجوہات	
70	نظم وضبط کا فقدان	
71	تعلیمی اداروں کے نظم وضبط میں کمی کے اسباب	
72	آبادی میں اضافہ	

	اضافہ آبادی اور تعلیم	73
	معیار تعلیم	73
	کم داخلہ اور ترک مدرسہ	76
	پاکستان میں ترک مدرسہ کی وجوہات	77
	ترک مدرسہ پر قابو پانے کے اقدامات	79
	تعلیم کے بارے میں عمومی رویہ	80
	تعلیم میں سرمایہ کاری	82
	تعلیمی اداروں میں طبعی سہولیات کی صورت حال	83
	معاشی اور معاشرتی حالات	83
پانچواں باب	تعلیم کے فروغ کے لیے مختلف تنظیموں کا کردار	89
	تعلیمی انتظام وانصرام	89
	صوبائی محکمہ تعلیم	89
	ضلعی سطح پر تعلیمی نظام	91
	یونیورسٹیوں کی تعلیم	92
	نصاب اور تدریسی مواد	93
	شعبہ تدوین نصاب وفاقی وزارتِ تعلیم	94
	صوبائی بیورو تدوین نصاب	95
	ٹیکسٹ بک بورڈ	96
	سٹاف ڈویلپمنٹ	96
	کالجز آف ایجوکیشن	97
	گورنمنٹ کالجز برائے ایلیمنٹری ایجوکیشن	97
	پرائیویٹ تنظیمیں	98
	امتحانات	99
	دیہی ترقی تعلیم	100
	فرہنگ	106
	کتابیات	107

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

پہلا باب

برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم

تعارف (Introduction)

انسانی تعلیم کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے ہی ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر بھیجنے سے پہلے اُن کو اشیا کے استعمال کا علم سکھایا تھا۔ دوسرا علم انسان کو اس علمِ ہدایت کی صورت میں عطا کیا جس کا انتظام وحی کے ذریعہ کیا گیا۔ جوں جوں انسانوں کی تعداد بڑھتی گئی خاندان اور قبیلے وجود میں آتے گئے۔ علم اور تہذیبی روایات والدین سے اولاد کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ جہاں بھی معاشرے کی تہذیب وثقافت میں بگاڑ پیدا ہوا اللہ تعالیٰ نے اس کی درست سمت میں رہنمائی کے لیے انبیا بھیجے جو معاشرے کو صحیح تعلیم سے آگاہ کرتے رہے۔ آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن پر آخری وحی بھیج کر اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل کر دیا۔ یہ علم قرآن پاک اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ دین کی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم کا ایک جامع نظام وضع کیا جس نے بعد میں مکتب اور مدرسہ کی شکل اختیار کی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے مکتب اور مدرسہ کے ذریعہ تعلیم کو اس قدر ترقی دی کہ ایک طرف برصغیر پاک وہند اور وسط ایشیا میں علم کا نور پھیلا اور دوسری طرف افریقہ اور یورپ میں مسلمانوں کی قائم کردہ یونیورسٹیوں میں ان کا تیار کردہ نصاب تعلیم سولھویں صدی کے بعد بھی پڑھایا جاتا رہا۔

مکتب اور مدرسہ کا نظام تعلیم کیا تھا؟ اس باب میں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ برصغیر میں مسلمانوں نے کس قسم کا نظام تعلیم قائم کیا۔

مکتب و مدرسہ

غارِ حرا کی پہلی وحی میں انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلا حکم پڑھنے کا نازل فرمایا۔ اس پہلی وحی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے علم کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اس حکم کی تعمیل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں کوہ صفا کی بلندی پر واقع حضرت ارقم ؓ کے گھر سے صحابہ کرام ؓ کو تعلیم دینے کی ابتدا کی۔ تعلیم زبانی تھی جو لوگ مسلمان ہوتے وہ چھپ چھپ کر اس گھر میں جمع ہوتے اور قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے۔ قرآن سکھانے کا اہتمام رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کرتے جتنا قرآن نازل ہوتا وہ صحابہ کرام ؓ زبانی یاد کر لیتے اور کتابت جاننے والے جو صحابی اس وقت موجود ہوتے ان سے وہ قرآنی آیات لکھوالی جاتی تھیں۔ مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کرائی جس میں ایک چبوترہ بنوایا گیا، عربی زبان میں اس کو صفہ کہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں صحابہ کرام ؓ کو قرآن مجید اور دین کی تعلیم دیتے تھے۔

اسلامی تاریخ میں اس کو پہلے باقاعدہ مدرسے کی حیثیت حاصل ہے۔ مدینہ کے اردگرد سے صحابہ کرامؓ یہاں آتے کچھ روز قیام کرتے اور دین کی تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے وطن لوٹ جاتے تھے اور وہاں لوگوں کی تعلیم شروع کر دیتے۔ اس لحاظ سے یہ اقامتی مدرسہ تھا۔ طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ ایک وقت میں یہاں ستر طلبہ کے قیام پذیر ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علاوہ یہاں دوسرے صحابہ کرامؓ بھی تعلیمی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کو قاری کہتے تھے۔ جوں جوں اسلامی معاشرہ پھیلتا گیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صحابہ کرامؓ کی تعلیم وتربیت کے لیے مختلف علاقوں میں معلمین بھیجتے رہے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر قبا میں ایک مسجد تھی وہاں بھی ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ اس کی نگرانی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خود فرماتے اور کبھی کبھی وہاں تشریف بھی لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں نو (۹) دوسری مساجد کا بھی ذکر ملتا ہے جن میں ایسے مدارس قائم تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اشاعت تعلیم میں اس قدر دلچسپی لی کہ تیئس (۲۳) سال کی قلیل مدت میں عرب کے ملک میں ایک تعلیمی انقلاب برپا کر دیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق ملک کی نصف سے زیادہ آبادی خواندہ ہوگئی۔

عہد نبوی میں صوبائی گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ بات شامل کر دی گئی کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کے لوگوں کی تعلیمی ضرورتوں کا خیال رکھیں۔ جوں جوں مختلف علاقے اسلامی سلطنت میں شامل ہوتے گئے مساجد کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ ہر گاؤں اور ہر محلے میں مسجد تعمیر ہوئی اور ہر مسجد اس آبادی کا مکتب اور مدرسہ بھی تھی۔ ان مساجد میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے مضامین تک پڑھائے جاتے تھے جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، ہیئت، ریاضی، منطق، علم الکلام اور طب وغیرہ کے علاوہ کسی خاص پیشہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ مدارج تعلیم اور نصاب مساجد میں قائم درسگاہوں کی حیثیت کا تعین کرتے تھے۔

خلفائے راشدین نے علم وہدایت کے فروغ کو جاری رکھا۔ حضرت عمر فاروق ؓ کو تعلیم میں باقاعدگی پیدا کرنے کا اس قدر خیال تھا کہ انھوں نے علما اور اساتذہ کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر فرمائیں۔ مساجد کی تعداد میں اضافہ توسیع تعلیم میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ہر مسجد میں مدرسہ قائم کرنے کی زبردست مہم چلائی جس سے تعلیم عام ہوگئی۔ دمشق، قاہرہ اور بغداد اپنے دَور کی عظیم درسگاہیں تھیں۔ ابتدا میں مکتب اور مدرسہ کی کوئی علیٰحدہ عمارت نہ تھی۔ مسجد جو ایک کثیر المقاصد ادارہ تھی مکتب اور مدرسے کے طور پر بھی استعمال کی جاتی تھی۔ معلم کا اپنا گھر یا کوئی عمارت بھی اس مقصد کے لیے استعمال میں لائی جاتی تھی۔

سلجوقی دَور میں مسلمانوں کے قائم کردہ نظام تعلیم میں زبردست تبدیلی یہ پیدا ہوئی کہ مدارس کی عمارتیں مسجد سے الگ تعمیر ہونے لگیں۔ الپ ارسلان کے وزیر نظام الملک نے اس قسم کا پہلا مدرسہ بغداد میں قائم کیا جو نظامیہ بغداد کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد میں اس نے خراسان، مرو، بصرہ، بلخ اور موصل میں بھی اسی قسم کے مدارس قائم کیے جن میں مروجہ علوم کے علاوہ عبرانی، لاطینی، فارسی، سنسکرت اور یونانی زبانوں کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور اس زمانے کے رواج کے مطابق طلبہ کو گھڑ سواری، تیراندازی، شمشیر زنی وغیرہ کی مشق بھی کروائی جاتی تھی۔ ان مدارس کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ وہاں کے اساتذہ کا تقرر خود حکمرانِ وقت کرتا تھا۔ امام غزالیؒ نے نظامیہ بغداد میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ سعدی شیرازی بھی نظامیہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ یہاں اپنے زمانے کے طلبہ کی تعداد سات ہزار بتاتے ہیں۔

اسی زمانہ میں اعلیٰ تعلیم کے حوالہ سے لفظ حلقہ بھی رائج ہو چکا تھا جب کوئی عالم کسی شہر میں آتا تو لوگ مسجد میں اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ استاد چوکی پر مسجد کے کسی ستون یا دیوار کے ساتھ بیٹھ جاتا، شاگرد اس کے گرد حلقہ کی صورت میں جمع ہو جاتے۔ استاد کسی فن

کے مسائل زبانی بیان کرتا شاگرد استاد کے لیکچر کو لکھ لیتے تھے۔ سوال پوچھنے کی عام اجازت تھی۔ ہر عمر کے لوگ شاگردوں میں شامل ہو سکتے تھے۔ طالبانِ علم دُور دراز کے سفر کر کے ان حلقوں میں شاگردی اختیار کرتے تھے۔ ان حلقوں اور مدارس کے علاوہ علما، وزرا، حکما اور امرا کے گھروں میں قائم مدارس بھی اشاعت تعلیم کا فریضہ انجام دینے لگے۔

مکتب

مکتب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی لکھنے کی جگہ یا لکھنے کی میز کے ہیں۔ مکتب کا لفظ عموماً ابتدائی تعلیم کے ایسے مدارس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جہاں طلبہ کو لکھنے کا فن سکھایا جاتا تھا۔ ایسے مکاتب معلم کے گھر یا مساجد میں قائم کیے جاتے تھے۔ مکتب کے استاد کو معلم کہتے تھے۔

مدارس

مدارس۔ جمع ہے مدرسہ کی، جس کے معنی درس کی جگہ کے ہیں اور درس کے معنی سبق کے ہیں یعنی درس یا سبق پڑھنے کی جگہ۔ مدارس ایسے ادارے کہلانے لگے جن کی ضرورت مکتب کی تعلیم کے بعد پیش آتی تھی۔ عموماً یہ مسجد سے باہر مختلف جگہوں پر قائم کیے جانے لگے۔ مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کو مدرس کہتے تھے۔ یہاں سائنس اور فلسفے کے علاوہ مختلف زبانیں بھی سکھائی جانے لگیں اساتذہ کی باقاعدہ تنخواہ اور طلبہ کے لیے وظائف مقرر کیے جانے لگے۔

جامعات

جامعہ یا یونیورسٹی کا درجہ قرون وسطیٰ میں اعلیٰ درجوں کی درسگاہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ نظامیہ بغداد اور دوسرے شہروں میں قائم ہونے والی درسگاہیں اسی درجہ کی تھیں۔ مستنصر باللہ نے 1233ء میں نظامیہ بغداد کے مقابلے میں اعلیٰ درجے کی ایک درسگاہ بنوائی جسے جامعہ مستنصریہ کہتے تھے۔ اس میں نظامیہ بغداد کے مقابلے میں علوم کے زیادہ شعبے کھولے گئے۔ عمارت بہتر بنائی گئی جس میں اساتذہ اور طلبہ کے لیے زیادہ سہولتیں مہیا کی گئیں۔ طلبہ کو جامعہ کی طرف سے چٹائیاں، کاغذ، دوات اور قلم کے علاوہ چراغ کے لیے زیتون کا تیل مفت مہیا کیا جاتا تھا۔ رہائش اور خوراک کے علاوہ طلبہ کو وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔

جامعہ ازہر قاہرہ میں نویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔ یہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے اور آج بھی اپنی شہرت رکھتی ہے۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ہزاروں غیر ملکی طلبہ یہاں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اپنے علاقوں میں جا کر تعلیم کی اشاعت کا باعث بنتے ہیں۔

اندلس میں اسلامی تعلیم کا باقاعدہ آغاز دسویں صدی عیسوی میں ہوا۔ قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ، اشبیلیہ اس کے مراکز تھے۔ یورپ کے طلبہ نے ان شہروں میں قائم یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی اور یورپ میں علمی احیا کا باعث بنے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد 712ء میں محمد بن قاسم کے فتح سندھ سے ہوئی جو طریقہ ہائے تعلیم اور نصاب عرب میں مروج ہو چکے تھے اس کے مطابق یہاں بھی تعلیم کی اشاعت شروع کی گئی۔ بعد میں سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے عہد میں مکاتب اور مدارس قائم ہوئے۔ ذیل میں برصغیر میں قائم ہونے والی درسگاہوں اور نظام تعلیم کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسلم مفکرین کی تعلیمی خدمات

مسلمانوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ''گود سے گور تک علم حاصل کرو'' پر عمل کرتے ہوئے تعلیم کے میدان میں بے شمار کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ تاریخ انسانی مسلمانوں کے عظیم علمی وادبی کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ تعلیم کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے کوئی ماہر تعلیم مسلمان اہل علم وفن کی پیشہ ورانہ خدمات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ذیل میں چار ممتاز مسلمان مفکرین تعلیم الغزالیؒ، ابن خلدون، ابن سینا اور زرنوجی کی تعلیمی خدمات کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے۔

الغزالیؒ (1058ء - 1111ء)

آپ کا نام امام محمد الغزالیؒ کے طور پر مشہور ہے۔ آپؒ ایک ماہر تعلیم اور بہترین استاد تھے۔ مفکر تعلیم کی حیثیت سے اہل مغرب بھی ان کا لوہا مانتے ہیں۔ آپ کی اکثر کتابوں کے تراجم کئی یورپی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ کیمیائے سعادت اور احیاء العلوم آپ کی اہم تصانیف ہیں۔ آپ مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر رہے۔ یہ ادارہ اس زمانے میں بین الاقوامی اہمیت کا حامل تھا۔

تعلیمی تصورات

امام غزالیؒ کے نزدیک حقیقت تک رسائی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ پیغمبروں کو جو علم وحی کے ذریعے پہنچتا ہے وہی سچا اور حقیقی علم ہوتا ہے۔ عقل علم کا منبع ہے اور عقل انسان کے اندر غور وفکر کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تعلیم کے ذریعے کائنات کو مسخر کرنے کی صلاحیت دی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی فضیلت علم ہے۔ علم میں بے پناہ قوت ہے یہ ساکن نہیں بلکہ رواں دواں ہے جس میں ہر لحہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انسان اس سے کائنات کے نئے نئے اسرار ورموز تک رسائی حاصل کرتا رہے گا۔ علم کی وجہ سے ہی انسان انسانیت کے درجہ پر فائز ہے۔ ایمان اور علم لازم وملزوم ہیں۔ ایسے علوم جو انسانوں کے لیے ضروری اور مفید ہیں جیسے قرآن، حدیث، فقہ اور مختلف پیشوں کا علم وغیرہ۔ امام غزالیؒ اُنھیں علومِ محمود کہتے ہیں اور وہ علوم جن میں انسانوں کے لیے نقصان کا کوئی پہلو موجود ہو انھیں علومِ مذموم کہتے ہیں۔

مقاصدِ تعلیم

امام غزالیؒ کے فلسفہ تعلیم اور ان کے دوسرے فلسفیانہ تصورات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی روشنی میں درج ذیل مقاصد تعلیم متعین کیے جاسکتے ہیں۔

1- معرفتِ الٰہی کا حصول

امام غزالیؒ کے نزدیک تعلیم کا اولین مقصد معرفتِ الٰہی یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی پہچان ہے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک انسان اس وقت تک ذات باری تعالیٰ کی پہچان حاصل نہیں کرسکتا جب تک وہ دینی تعلیم بالخصوص قرآنی تعلیم تک رسائی حاصل نہ کرے اور اُس کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم بھی حاصل کرتا رہے۔

2- رضائے الٰہی کے آگے سرِتسلیم خم کرنا

امام غزالیؒ کے نزدیک تعلیم کا دوسرا بڑا مقصد رضائے الٰہی کے آگے سرِتسلیم خم کرنا ہے اور اس کا فرمانبردار بندہ بننا ہے۔ جب انسان معرفت الٰہی کا درجہ حاصل کرلیتا ہے تو اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تمام خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے احکامات

کے مطابق ڈھال لے۔

3- اخلاقی اقدار کا فروغ

امام غزالیؒ کے نزدیک تعلیم کا تیسرا بڑا مقصد اخلاقی اقدار کا فروغ ہے۔ معلم کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تعلیمات کے ذریعے اخلاقی تربیت اور اخلاقی اقدار کے فروغ پر بہت زور دیا، مثلاً سچائی، دیانت داری اور بڑوں کا احترام وغیرہ

4- اعلیٰ کردار کی تشکیل و تکمیل

امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ اچھی تعلیم وہی ہے جو انسان کو انسانیت کے درجے پر فائز کرتی ہے وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر کے نیکی کو اپناتا ہے اور برائی کے کاموں کو ترک کر دیتا ہے۔ انسان اپنے اچھے کردار اور نیک اعمال سے پہچانا جاتا ہے اور یہ اوصاف انسان میں تعلیم کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔

5- دنیاوی ضروریات کا خیال

امام غزالیؒ کے نزدیک تعلیم کا مقصد دنیوی ضروریات کو پورا کرنا بھی ہے۔ آپؒ کے نزدیک افراد کو ایسی تعلیم دینا چاہیے جو انھیں ایک مثالی زندگی گزارنے کے قابل بنائے اور ان کی دنیوی ضروریات کو پوری کرنے کا باعث بنے۔ اسی لیے آپؒ دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیوی علوم سیکھنے پر بھی زور دیتے ہیں۔

6- تسخیرِ کائنات

امام غزالیؒ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کائنات کے اسرار و رموز کو جاننا اور نوع انسانی کے لیے انھیں کام میں لانا تعلیم کا ایک انتہائی اہم مقصد قرار دیا ہے۔

نصابِ تعلیم

امام غزالیؒ نے مضامین کی درجہ بندی کر کے نصابِ تعلیم کو لازمی مضامین اور اختیاری مضامین میں تقسیم کیا ہے۔ امام غزالیؒ لازمی مضامین کو فرضِ عین قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان مضامین کا حصول ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے۔ اس میں وہ اسلام کے بنیادی عقائد اور عمر کے مطابق قرآن و حدیث کی روشنی میں عبادات و معاملات کے بارے میں علوم کو شامل کرتے ہیں۔ وہ تدریج کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یعنی عمر کے مطابق روزمرہ زندگی میں عبادات و معاملات کی جو صورت پیش آئے اس کے بارے میں علم حاصل کرنا فرض عین یعنی لازمی ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم کو وہ ہر مسلمان کے لیے لازمی مضامین میں شامل کرتے ہیں۔

اختیاری مضامین کو امام صاحب فرض کفایہ کا نام دیتے ہیں۔ ان میں وہ مضامین شامل ہیں جن کے بغیر معاشرے کا کاروبار نہیں چلتا۔ اگر معاشرے میں ان علوم کے جاننے والے افراد مناسب تعداد میں موجود ہوں تو معاشرے کا کام چلتا رہے گا۔ اسی مناسبت سے ان کو فرض کفایہ کہا گیا ہے۔ ان میں طب، ریاضی، زراعت، صنعت و حرفت، پارچہ بافی اور علم سیاسیات وغیرہ شامل ہیں۔

طریقہ تدریس

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید مغربی مفکرین تعلیم نے تعلیمی تحقیق کی بنیاد پر جو طریقہ ہائے تدریس پیش کیے ہیں ان میں طالب علموں کی نفسیات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ امام غزالیؒ نے تدریس کے جو طریقے اس سے بہت پہلے بتائے وہ تعلیمی

نفسیات کے عین مطابق تھے۔ان کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

بچوں کے رُجحانات کے مطابق تعلیم دینا

امام غزالیؒ کے نزدیک تعلیم میں بچوں کے طبعی رجحانات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔دوران تدریس معلم اپنے شاگردوں کے طبعی رجحانات، میلانات اور مزاج کا خیال رکھے۔

تدریس میں تدریج

امام غزالیؒ تدریس میں تدریج کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک تدریج سے مراد علم کو درجہ بدرجہ اور مرحلہ وار پیش کرنا ہے۔امام غزالیؒ اس نقطہ نظر میں مغربی مفکرین کے پیش رو ہیں۔انھوں نے نفسیاتی طریقہ ہائے تعلیم کی وضاحت اپنی کتاب احیاء العلوم میں بڑی تفصیل سے کی ہے۔

ذہنی استعداد کے مطابق تعلیم دینا

امام غزالیؒ نے طلبہ کی ذہنی استعداد کے مطابق انھیں تعلیم دینے کی سفارش کی ہے۔امام غزالیؒ کا کہنا ہے کہ اساتذہ تدریس کے دوران بچوں کی ذہنی استعداد کو مدنظر رکھیں ورگرنہ تعلیم کے مطلوبہ مقاصد پورے نہیں ہوں گے۔

سابقہ معلومات کی مدد سے تعلیم دینا

امام غزالیؒ نے اساتذہ کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ نئے سبق کو بچوں کی سابقہ معلومات سے مربوط کریں اور بچوں کو ان کے پہلے سے حاصل شدہ تعلیمی تجربات کی روشنی میں نئی معلومات فراہم کریں۔

عمل کے ساتھ مشروط کر کے تعلیم دینا

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تعلیم کے اس وقت تک خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکتے جب تک کہ اسے عمل سے مشروط نہ کیا جائے یعنی جو پڑھا جائے اُس پر عمل کیا جائے۔

بچوں کے لیے سبق آسان بنائے جائیں

امام غزالیؒ نے تدریس کے جو طریقے پیش کیے ان کے مطابق اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنے اسباق کو دلچسپ اور آسان بنائیں۔ سبق کو دلچسپ بنانے کے لیے قصے، کہانیوں اور حکایات کی مدد بھی لی جا سکتی ہے۔

اسباق کی تیاری

سبق کی تیاری کے بغیر ایک معلم اپنے پیشے سے انصاف نہیں کر سکتا۔امام غزالیؒ اساتذہ کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ سبق پڑھانے سے پہلے اس کی اچھی طرح تیاری کر لیں۔

استاد شاگرد تعلقات

امام غزالیؒ نے استاد اور شاگرد کے تعلقات اور آداب پر کافی تفصیل سے بات کی ہے جو ذیل میں دی جا رہی ہے۔

آدابِ معلّم

امام غزالیؒ کے نزدیک جو شخص خود کو معلم کے درجے پر فائز کرتا ہے وہ درج ذیل باتوں کا خیال رکھے:

1- شاگردوں کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے برابر سمجھے اور ان سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آئے۔

2- اپنے قول و فعل میں مطابقت پیدا کرے۔

3- اپنے شاگردوں سے ان کے معیار اور استعداد کے مطابق گفتگو کرے۔

4- تعلیم کا صلہ طلب نہ کرے اور نہ ہی خوشامد اور تعریف کی خواہش کرے۔

5- جہاں تک ممکن ہو طلبہ کو نصیحت کرتا رہے۔

6- شاگردوں کو اشاروں، کنائیوں اور پیار و محبت سے راہ راست پر لائے اور بُری باتوں سے روکے۔ سختی کرنے سے طلبہ کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور معلم کا وقار کم ہو جاتا ہے۔ انتہائی ناگزیر حالات میں امام غزالیؒ نے تین چھڑیوں کی حد تک بدنی سزا کی اجازت دی ہے۔

متعلم کے آداب

امام غزالیؒ نے متعلم کو بھی کچھ باتوں کی نصیحت کی ہے۔ آج کے طالب علموں کے لیے بھی امام غزالیؒ کی یہ باتیں نشانِ راہ ہیں:

1- اپنے علم پر تکبر نہ کرے۔

2- استاد کی فرمانبرداری کو اپنا شعار بنائے۔

3- اپنے نفس کو بری عادات سے دُور رکھے۔

4- تمام علوم و فنون کا بنیادی علم حاصل کرے لیکن ایک فن یا علم پر پوری دسترس اور مہارت حاصل کرے۔

5- کسی ایک فن پر پوری طرح مہارت حاصل کر لینے سے پہلے، دوسرے فن میں قدم نہ رکھے۔

6- کسی فن یا علم کو ایک دم اکٹھا حاصل کرنے کی بجائے تدریجاً حاصل کرے۔

ابن خلدون (1332ء - 1406ء)

ابن خلدون کا اصل نام ولی الدین عبدالرحمٰن تھا۔ تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد میں تیونس کے علما سے استفادہ کیا اور علم و ادب میں اپنا ایک مقام بنایا۔ لغت، شعر و شاعری، فقہ اور حدیث میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ روزگار کے لیے تیونس کے امیر کے دربار میں کاتب کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ مختلف اوقات میں وزارت کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ جامعہ ازہر میں فقہ پڑھاتے رہے۔ قاضی القضاۃ بھی رہے۔ ان کی اصل وجہ شہرت ان کی تصنیف مقدمہ ابن خلدون ہے۔

تعلیمی تصورات

آپ کی کتاب مقدمہ ابن خلدون اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور عربی علم و تہذیب پر بحث شامل ہے۔ ''المقدمہ'' جو آپ کی اس کتاب کے ساتھ مقدمے کے طور پر شامل تھا اور اب اسے ایک مکمل تصنیف کی حیثیت حاصل ہے۔ تعلیم و تعلم اس مقدمے کا ایک موضوع ہے۔ اس موضوع پر ابن خلدون نے مختلف مقامات پر ماہرانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے چند پہلوؤں کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابن خلدون نے تعلیمی نظریات میں جس خصوصی بات کا اضافہ کیا ہے وہ انسانی فطرت کا سیکھنے کا ''تقاضا'' ہے۔ ابن خلدون کا کہنا ہے کہ انسان سیکھنے پر مجبور ہے۔ سیکھنا اس کا فطری اور جبلی تقاضا ہے۔ اس سے پیشتر کسی ماہر تعلیم نے انسانی فطرت کے بارے میں ایسی بات نہیں کی۔

ابن خلدون کے خیال میں جس طرح خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ کا حصول انسانی ضروریات کا ایک تقاضا ہے، اسی طرح حصول تعلیم بھی فطرتِ انسانی کا ایک تقاضا ہے۔ انسانی فطرت میں سیکھنے کی صلاحیت ہی تعلیم کی بنیاد ہے۔ سیکھنا انسانی سرشت ہے اور انسان کو اپنی سرشت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ کے اس نظریہ کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ مغرب کے جدید نظریات جن میں تعلیم کو فرد کا حق قرار دیا گیا ہے اس کے سامنے بہت ہیچ ہیں۔

ابن خلدون حصول تعلیم کے لیے غور و فکر کو بہت اہمیت دیتے ہیں لیکن آپ کے خیال میں حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لیے پیغمبروں کی تعلیمات پر ایمان لانا ضروری ہے۔

مقاصد تعلیم

ابن خلدون کے عمرانی تصورات، مقاصد تعلیم کے تعین میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

1- تعلیم انسان کی طبعی ضرورت

یہ ابن خلدون کا بڑا ہی نادر اور جدید تصور ہے کہ تعلیم انسان کی ایک ایسی ہی طبعی ضرورت ہے جیسے حفاظت نفس، خوراک، لباس وغیرہ۔

2- اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول

ابن خلدون کے نزدیک امام غزالیؒ کی طرح علم کا مقصد معرفت الٰہی یا علم حقیقت کا حصول ہے۔ وہ حواس خمسہ کی حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ فرماتے ہیں کہ حواس خمسہ سطحی علم کی بنیاد ہیں اور علم معرفت کے حصول کے لیے ناکافی ہیں۔

تعلیم کا بنیادی فرض یہ ہے کہ بچوں کو اسلامی عقائد سے روشناس کرائے۔ معرفت کے حصول کے لیے ایمان اور عقیدے کی پختگی بنیادی شرط ہے۔ اس کے لیے ایک اور حس کی ضرورت ہے لیکن یہ حس قدرت نے ہر ایک کو نہیں دی۔ چند افراد ہی اس سے فیض یاب ہوئے ہیں جنھیں پیغمبر کہا جاتا ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ان احکامات پر ایمان لائے جو پیغمبروں نے ہم تک پہنچائے ہیں۔ ان احکامات پر ایمان لانا علم معرفت کی پہلی سیڑھی ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک تعلیم کا سب سے بڑا مقصد حقیقت اور معرفت کا حصول ہے اور اس کے لیے ایمان کی پختگی شرط ہے۔

3- تخلیق واجتہاد کی صلاحیتوں کی نشوونما

ابن خلدون کے زمانے میں علوم رٹوائے جاتے تھے اور اس کو علمی کمال سمجھا جاتا تھا۔ ابن خلدون نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ابن خلدون انسان کی غور و فکر کی صلاحیت کے بہت معترف ہیں۔

آپ نے تدریس کے سلسلہ میں بحث و مناظرہ کی صرف اس لیے حوصلہ افزائی کی کہ اس طرح انسانی سوچ پر نئی نئی راہیں کھلتی

ہیں اور وہ تقلید و جمود کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے اس کی تخلیقی اور اجتہادی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور یہی تعلیم کا مقصد ہے۔

4- اعلیٰ انسانی اقدار کی نشوونما

ابن خلدون انسان کو بہت معزز قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جو انسان کی عزت نفس کے منافی ہو۔ کیونکہ اس سے شرف انسانی گر جاتا ہے اور انسان میں اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ سزا کے بھی اسی لیے خلاف ہیں کہ سزا کے خوف سے بچے اخلاق رذیلہ اختیار کرتے ہیں، حیلہ سازی اور جھوٹ وغیرہ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ تعلیم کے ذریعہ انسانوں میں خود اعتمادی، غیرت، حمیت، شجاعت وغیرہ جیسی اعلیٰ اقدار کی نشوونما چاہتے ہیں۔

5- غور و فکر کی صلاحیت کی نشوونما

ابن خلدون طلبہ میں غور و فکر کی صلاحیت کی نشوونما کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ علم کی نشوونما بھی اسی صلاحیت کی نشوونما سے ممکن ہے۔ انسان اپنے اردگرد کے ماحول پر غور کرتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے سوچتا ہے۔ انسان نے اپنی قوت فکر کو کام میں لا کر عمرانی زندگی کا آغاز کیا تھا اور یہی قوت فکر اسے حیوانوں سے بلند مرتبہ دلاتی ہے اور اسی قوت کی بدولت انسانی معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ علم کا اصل مقصد ان کے نزدیک معرفت الٰہی یا علم حقیقت کا حصول ہے جو غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ ایمان کی پختگی کو بھی اس کے لیے لازم ٹھہراتے ہیں۔

ابن خلدون کے جو دوسرے مقاصد تعلیم ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں:

i- علمی ملکہ پیدا کرنا۔

ii- دنیا و آخرت میں کامیاب زندگی کے لائق بنانا۔

iii- عمرانی زندگی کے تقاضوں کا اہل بنانا۔

نصاب تعلیم

ابن خلدون کے خیال میں نصاب تعلیم طالب علم کے رُجحان، استعداد اور عمر کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ نصاب جامع ہو اور اس میں تدریج کا خیال رکھا گیا ہو، وہ تجویز کرتے ہیں کہ پرائمری تعلیم کا آغاز مادری زبان سے کیا جائے کیونکہ اجنبی زبان میں تعلیم نصف تعلیم کے مترادف ہے۔ پھر اسے حساب سکھایا جائے۔ بعد میں قرآن پاک کی تعلیم دی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ابتدا میں بچے کی فکر ناپختہ ہوتی ہے۔ حساب اور مادری زبان میں مہارت سے طالب علم کی فہم و فراست میں اضافہ ہوتا ہے جس سے دوسرے علوم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

انھوں نے تمام علوم کو دو اقسام طبعی یا عقلی علوم اور تقلیدی یا نقلی علوم میں تقسیم کیا ہے۔

عقلی علوم سے مراد وہ علوم ہیں جن میں انسان عقل اور غور و فکر سے ملکہ حاصل کرتا ہے۔ ان میں منطق، فلسفہ، ہندسہ، طبعیات، معدنیات اور موسیقی وغیرہ شامل ہیں۔ یا آج کے دور میں طب، انجینئرنگ، وکالت وغیرہ وغیرہ۔

نقلی علوم سے وہ علوم مراد ہیں جن کا سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ ان میں تفسیر، حدیث، فقہ، لغت وغیرہ شامل ہیں۔

طریقہ تدریس

ابن خلدون نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ تدریس میں طلبہ کی سہولت کو پیش نظر رکھا جائے۔ ان کے خیال میں مشکل انداز

اختیار نہ کیا جائے۔آپ طلبہ کی سہولت کے پیش نظر نفسیاتی طریقے اختیار فرماتے تھے۔ان کا کہنا ہے کہ معلوم سے نامعلوم اور آسان سے مشکل کی طرف بڑھنا چاہیے۔اس طرح طلبہ بات کو اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں۔تدریس میں بہتری کے لیے انھوں نے جو طریقے تجویز کیے ہیں ان میں نیاپن ہے اور آج بھی ان کی افادیت مسلمہ ہے۔

تدریج کا اصول

وہ تدریج کے اصول کے قائل ہیں اور تدریس کو موثر بنانے کے لیے نصاب کو تین ادوار میں تقسیم کرنے کے قائل ہیں۔ان کا خیال ہے کہ پہلے دور میں علم رفتہ رفتہ اور تھوڑا تھوڑا ذہن نشین کرایا جائے۔ ہر باب کے بنیادی اصول طلبہ کو ذہن نشین کرائے جائیں۔ دوسرے دور میں کچھ اونچی سطح کے مسائل زیر بحث لائے جائیں۔تیسرے دور میں علم اور فن کی تدریس تو ابتدا سے کی جائے لیکن اس دور میں کسی مسئلہ کو بغیر مکمل تشریح کے نہ چھوڑا جائے۔ اس دور میں طلبہ کو فن کی باریکیاں مکمل طور پر ذہن نشین کرادینی چاہئیں کیونکہ تیسرے دور میں فن کو سمجھنے کی خاصی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔

بحث ومناظرہ کا طریقہ

علامہ رٹہ بازی کے سخت خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ طلبہ میں سوجھ بوجھ اور غور وفکر کی صلاحیت پیدا کی جائے جس سے وہ مسائل زندگی حل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ سفارش کرتے ہیں کہ کلاس میں بحث ومناظرہ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔اس طرح ان کا خیال تھا کہ طلبہ میں سوچنے سمجھنے کی صحیح صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

حصول علم کے لیے سفر کی اہمیت

ابن خلدون حصول علم کے لیے سفر کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔آپ کے زمانے میں اعلیٰ تعلیم کے دار العلوم زیادہ نہ تھے اور عموماً دور دراز کے شہروں میں واقع تھے۔اعلیٰ علوم کے حصول کے لیے سفر اختیار کرنا ضروری تھا۔ابن خلدون ایسے سفر کو اہمیت دیتے ہیں اور مستحسن خیال کرتے ہیں۔

- ☆ ایک وقت میں ایک فن پڑھایا جائے۔اس میں پختگی کے بعد دوسرا علم یا فن سیکھنا شروع کیا جائے۔
- ☆ طالب علموں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا جائے۔ان سے سختی نہ کی جائے بلکہ شفقت اور ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے۔
- ☆ ابن خلدون تعلیم کے لیے طلبہ کو سزا دینے کے خلاف ہیں۔ان کے خیال میں طلبہ کو سزا دینے سے وہ شرف انسانیت سے گر جاتے ہیں۔

علامہ ابن خلدون رٹہ بازی کے خلاف ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سبق طلبہ کے سامنے سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا جائے جو ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہو، تاکہ وہ سبق کو رٹنے کی بجائے سمجھ کر ذہن نشین کر لیں۔ رٹے بازی سے بچے کی ذہنی تربیت پر اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔

استاد شاگرد تعلقات

علامہ ابن خلدون نے اپنی تصنیف المقدمہ میں ایک پورا باب اس بات پر لکھا ہے کہ شاگردوں پر سختی کرنا ان کے لیے مضر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ استاد کی سزا سے شاگرد شرف انسانی سے گر جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولنا شروع کر دیتے ہیں اور سزا سے بچنے کے لیے چالاکی اور عیاری سے کام لیتے ہیں۔

آپ اساتذہ کونصیحت کرتے ہیں کہ وہ شاگردوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کریں۔ان پر سختی نہ کریں۔افہام وتفہیم کی فضا میں آزادیٔ اظہار رائے (Freedom of Expression) کے مواقع فراہم کریں۔اس سلسلہ میں وہ بحث ومباحثہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔وہ طالب علم کی متوازن نشوونما کی غرض سے جبر وتشدد کی سختی سے ممانعت کرتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنا طالب علم کا فطری تقاضا ہے۔طالب علم پر سختی کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

آپ کے تعلیمی تصورات میں طالب علم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس کی تعلیم وتدریس کے سلسلہ میں نفسیاتی طریقوں پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ابن سینا (980ء - 1038ء)

آپ کا نام ابوعلی حسین بن عبداللہ بن حسن بن علی بن سینا ہے۔آپ شیخ بوعلی سینا کے نام سے مشہور ہیں۔یورپ میں آپ (Avecena) کے نام سے جانے جاتے ہیں۔آپ چھ(۶) برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ بخارا پہنچے۔ان دنوں بخارا علوم وفنون کا مرکز تھا۔دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔

ابن سینا نے مطالعے سے تصوف، طبیعیات، فلکیات، ریاضی، موسیقی اور مابعد الطبیعات میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے اساتذہ آپ کی علمیت کی مثال دینے لگے۔اکیس برس کی عمر میں آپ نے مختلف علوم میں کمال حاصل کرلیا اور تصنیف وتالیف کا کام شروع کردیا۔

آپ کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔آپ کی کتاب ''الشفا'' اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔اسے جامع العلوم یعنی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے۔اس میں مختلف علوم فلکیات، طبیعیات، مابعد الطبیعات، کیمیا، ریاضی، موسیقی اور حیاتیات جیسے مضامین پر بحث کی گئی ہے۔ان کی بہت سی تصانیف کے ترجمے یورپ کی کئی زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔

آپ ابوریحان البیرونی کے ہمراہ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں بھی پہنچے۔بعد میں آپ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔وفات سے پہلے سارا مال ودولت اللہ کی راہ میں صدقہ کردیا۔غلام آزاد کردیے اور تلاوت قرآن پاک کو معمول بنالیا۔

تعلیمی تصورات

ابن سینا عقل اور منطقی استدلال کو علم کے حصول کا صحیح ترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ان کے خیال میں عقل ہی حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کو علم کی منظم صورت میں پیش کرتی ہے۔عقلی اور منطقی استدلال صحیح معیار ہے اور علم کی بنیاد ہے۔ان کا تصور یہ تھا کہ علم کا سرچشمہ عقل موثر ہے اور عقل موثر کے ساتھ ہم آہنگی کے نتیجے میں علم حاصل ہوتا ہے۔عقل موثر انسان کے طبعی میلان اور فطری صلاحیت کے ساتھ مل کر چھٹی حس کی صورت اختیار کرتی ہے اور علم کو قابل فہم شکل میں پیش کرتی ہے۔

ان کا تصور قدر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور انسان کی عبودیت کے محور کے گرد گھومتا ہے۔نظام تعلیم میں اسی قدر کو نصب العین کی حیثیت حاصل ہوگی۔عبادات اسلامی کی پابندی، فکر وعمل میں خلوص اور رضائے الٰہی کو مقاصد تعلیم میں بنیادی اہمیت حاصل رہے گی۔

مقاصد تعلیم

ابن سینا کے بنیادی فلسفیانہ تصورات سے مندرجہ ذیل مقاصد تعلیم اخذ کیے جاسکتے ہیں:

1- ابن سینا کے نزدیک تعلیم کا سب سے اہم اور بنیادی مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان کو وصیت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے اور سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھا جائے۔

2- ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ان کے نزدیک ایک اہم مقصد تعلیم ہے کیونکہ ان کے نزدیک علم حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ عقل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان عقل کے ذریعے علم حاصل کرے تو وہ کبھی غلطی نہیں کرسکتا۔

3- ابن سینا کے خیال میں علم و عقل میں مطابقت بہت ضروری ہے۔ ان کے نزدیک بہترین عمل وہ ہے جس کی بنیاد خلوص نیت اور علم پر رکھی جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ علم اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ جو علم حاصل کیا جائے اس پر عمل بھی کیا جائے۔ ان کی نظر میں علم کے بغیر عمل بے کار ہے۔ لہٰذا علم و عمل میں ہم آہنگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

نصاب تعلیم

ابن سینا نے براہ راست نصاب کے حوالہ سے کوئی بات نہیں کہی ہے، لیکن علوم کو تین مدارج میں تقسیم کیا ہے:

اعلیٰ علوم: وہ علوم جو حکمت و دانش پر مبنی ہیں۔ ان میں فلسفہ، منطق اور اخلاقیات جیسے علوم شامل ہیں جن کا مادے سے کوئی تعلق نہیں۔

دنیوی علوم: جن کا مادے سے تعلق ہے، مثلاً علم کیمیا، علم طبیعیات اور علم طب وغیرہ۔

وسطی علوم: وہ علوم جو بعض خصوصیات اور پہلوؤں سے مادی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض خصوصیات اور پہلوؤں سے مابعد الطبیعاتی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً علم ہندسہ، علم فلکیات، فن موسیقی اور حساب وغیرہ۔

حکمت تدریس

ابن سینا کی حکمت تدریس کی کوئی تفصیل تو دستیاب نہیں ہے لیکن وہ عملی مدرس تھے۔ طب اور فلسفہ کا درس دیتے تھے۔ ان کی عملی زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس زمانے کے عام اساتذہ کی طرح رات کا ایک حصہ مطالعہ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ یہ چیز طلبہ کے لیے مشعل راہ ہے۔ طلبہ کے لیے ان کی ہدایات یہ ہوسکتی ہیں۔

i- ریاکاری سے بچیں اور خلوصِ نیت سے علم حاصل کریں۔

ii- اسلامی عبادات اور شعائر کی پابندی کریں جس میں نماز اور روزہ شامل ہیں۔

iii- جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے کہ لذتوں کا استعمال بلاضرورت نہ کیا جائے۔

iv- عقل اور سعادت کے حصول کے لیے دنیا و مافیہا سے بے نیازی ضروری ہے۔

استاد اور شاگرد کے تعلقات

انھوں نے ایک وصیت میں ایسا لائحہ عمل دیا ہے جو شاگردوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

"تم کو سب سے پہلے اور سب سے آخر میں خدا کا خیال کرنا چاہیے اور اپنی آنکھوں میں اس کے دیدار کا سرمہ لگانا چاہیے۔ اس کے بعد پاؤں جما کر کھڑے رہنا چاہیے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے بہتر حرکت نماز، سب سے بہتر سکون روزہ، سب سے مفید نیکی صدقہ اور سب سے رائیگاں کوشش ریاکاری ہے۔ بحث و مباحثہ میں مشغول رہنے سے دل کا زنگ دُور نہیں ہوتا۔ بہترین عمل وہ ہے

جو خلوص نیت سے کیا جائے اور بہترین نیت وہ ہے جو علم سے پیدا ہو۔لذتوں کا استعمال صرف اس غرض سے کرنا چاہیے کہ طبیعت کی اصلاح ہو۔ آدمی کا وجود قائم رہے یا نوع کو بقا حاصل ہو۔ اس کے ساتھ قواعد شرعیہ کی پابندی میں خلل نہ آنے پائے اور جسمانی عبادات کا ہمیشہ پابند رہنا چاہیے۔''

علامہ زرنوجی (1170ء - 1255ء)

علامہ زرنوجی عرب کے عظیم فلسفی، دانشور اور ماہر تعلیم تھے۔ ان کے حالات زندگی تفصیل سے نہیں ملتے۔ ایک روایت کے مطابق آپ 1170ء میں پیدا ہوئے اور پچاسی (۸۵) سال کی عمر پائی۔

علامہ زرنوجی نے تعلیم و تربیت کے فن پر 1203ء میں ''تعلیم المتعلم طریق التعلم''، لکھی۔ اس کتاب کو ہدایات نامہ متعلم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ علامہ زرنوجی نے ''تعلیم المتعلم'' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ طلبہ سخت محنت کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کیوں ناکام رہتے ہیں۔ ان وجوہات کی نشاندہی میں تعلیم، اس کے محرکات اور اس کے مختلف طریقوں سے بحث کی گئی ہے، یعنی اس کتاب میں تعلیم کی نفسیاتی بنیادوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ صاحب نے جن تدریسی طریقوں اور تدابیر کی نشان دہی کی ہے ان کی روشنی میں ایک معلم اپنی تدریسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف متعلمین کو راہنما اصول مہیا کرتی ہے بلکہ معلم کی راہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔ علامہ زرنوجی کی ''تعلیم المتعلم''، تعلیم و تربیت کے موضوع پر ایک منفرد تصنیف ہے۔

تعلیمی تصورات

علامہ زرنوجی کے تعلیمی تصورات کی بنیاد دین اسلام پر ہے۔ علم کی اہمیت کے سلسلے میں انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو بنیاد بنایا کہ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔'' وہ فرماتے ہیں کہ ایک فرد تمام علوم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے تمام علوم کا حاصل کرنا فرض نہیں ہے۔ تاہم طالب علم جو علم حاصل کرے اس کے تمام اصول و ضوابط جاننا فرض ہے۔

آپ علم کی فضیلت اور وسعت کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا ایک مشہور قول نقل کرتے ہیں کہ استاد ہر وقت اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے اور امیر لوگ استاد کے عمامے کی عزت کریں اور اپنی جیبوں میں وسعت پیدا کریں۔

مقاصد تعلیم

1- علامہ زرنوجی نے رضائے الٰہی کے حصول اور آخرت میں کامیابی کو تعلیم کے حصول کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا ہے۔ آپ ایسے شخص کو بدنصیب خیال کرتے ہیں جو اس مقصد کے لیے علم حاصل کرے کہ لوگ اس کی عزت کریں اور اس کے سامنے تحائف پیش کریں۔

2- علامہ علم کے ذریعے عزت و مرتبہ اور رعب و دبدبہ صرف اس حد تک جائز قرار دیتے ہیں کہ انسان اُس سے لوگوں میں اچھائی اور نیکی کی اشاعت کر سکے۔

3- علامہ اساتذہ کو ان تمام چیزوں سے احتیاط برتنے کی تلقین کرتے ہیں جن سے علم اور اہل علم کی تحقیر ہوتی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ استاد کو تکبر اور ذلت نفس دونوں سے دامن بچانا چاہیے۔

نصاب تعلیم

علامہ زرنوجی نصاب میں قرآن و حدیث، فقہ و اصولِ فقہ اور طب جیسے مضامین شامل کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سب سے

پہلے قرآن وحدیث کی تعلیم دینی چاہیے۔ ان کے نزدیک قرآن وحدیث کو لازمی مضامین کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد ثانوی درجات میں فقہ اور اصول فقہ کی تدریس ہونی چاہیے۔ ان کے خیال میں فقہ کا علم اتنا ضروری ہے جتنی انسانی زندگی کے لیے خوراک۔ اعلیٰ درجوں میں طب کی تعلیم دی جائے، تاہم فقہ اور طب جیسے مضامین اختیار کرنے میں طلبہ کو آزادی ہونی چاہیے۔ مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں معلم طلبہ کی رہنمائی کرے۔

طریقہ تدریس

آپ نے تدریس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اساتذہ پر زور دیا ہے کہ وہ نفسیاتی طریقے استعمال کریں۔ آپ فرماتے ہیں کہ معلم کے پڑھانے کا طریقہ تعلیمی عمل کو تحریک دینے کا باعث بنتا ہے۔ استاد کو چاہیے کہ وہ پڑھاتے ہوئے طلبہ کے نفسیاتی تقاضوں اور ضروریات کو مدنظر رکھے۔ اس طرح طلبہ زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

استاد اور شاگرد کے تعلقات

علامہ زرنوجی نے اس سلسلہ میں کوئی خصوصی تحریر نہیں چھوڑی تاہم ان کی طلبہ کے لیے ہدایات اس موضوع پر خاصی روشنی ڈالتی ہیں۔

طلبہ کے لیے ہدایات

علامہ زرنوجی نے ''تعلیم المتعلم'' خصوصی طور پر طلبہ کے لیے لکھی تھی۔ اس لیے انھوں نے بڑی تفصیل سے طلبہ کے لیے ہدایات اور رہنما اصول تحریر کیے ہیں۔

استاد کا انتخاب

علامہ زرنوجی استاد کے انتخاب کے لیے طالب علم کو تاکید کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں بڑی احتیاط سے کام لے۔ والدین، بزرگوں اور دوسرے اہل علم سے پوری سنجیدگی سے مشورہ کر کے استاد کا انتخاب کرے۔ جب انتخاب کرلے تو مضمون کی تکمیل تک استاد نہ بدلے۔ اس سے طالب علم کا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا اور استاد کی شہرت بھی برقرار رہے گی۔ استاد ایسا منتخب کیا جائے جو تجربہ کار، پرہیزگار اور صاحب علم ہو۔

صبر وتحمل

تعلیم کا سلسلہ آہستہ آہستہ اور صبر وتحمل کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ اس کے لیے علامہ نے ایک مثال دی ہے کہ لکڑی کی چھڑی کو صرف ہلکی ہلکی آنچ پر ہی سیدھا کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کے حصول میں تعطل نہ آنے دیا جائے اور غربت کو بھی آڑے نہ آنے دیا جائے خواہ اس کے لیے محنت مزدوری ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

شریک درس ساتھی کا انتخاب

اپنے ہم درس ساتھیوں میں سے دوست ایسے طالب علم کو بنایا جائے جو محنتی، صالح، پرہیزگار اور سلیم الطبع ہو، سست، غلط کار، فسادی، فتنہ پرداز اور بے ہودہ طالب علم کو ساتھی نہ بنایا جائے۔

تعلیم کا موزوں دور

علامہ زرنوجی نے اس حدیث ''علم حاصل کرو مہد سے لحد تک'' کا حوالہ دیا ہے لیکن وہ نوبلوغت کے دور کو تعلیم حاصل کرنے کے

لیے موزوں ترین دور خیال کرتے ہیں۔

مطالعے کا مناسب وقت

علامہ رات کے اوقات کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اونٹ رات کو بہتر سفر طے کرتا ہے اسی طرح انسانی ذہن بھی رات کے اوقات میں بہتر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ رات میں بھی مغرب کے بعد اور سحری کا وقت موزوں ترین ہے۔

مطالعے کا طریقہ

علامہ زرنوجی حفظ کی بجائے فہم پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں سمجھ کر دو حروف سیکھنا دو بڑی کتابوں کے رٹنے سے بہتر ہے۔ تاہم سوچ سمجھ کر حفظ کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے اور اس کے لیے تکرار کے طریقے کو مفید طور پر استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں، ان کے خیال میں طالب علم کل کے سبق کو پانچ مرتبہ دُہرائے۔ اس سے ایک روز قبل کے سبق کو چار بار اور اس سے مزید ایک روز قبل والے سبق کو ایک مرتبہ دُہرائے۔

مطالعے میں اعتدال

طالب علم مطالعے میں اعتدال سے کام لے تاکہ وہ کمزور نہ ہو جائے اور قوت کار کھو نہ بیٹھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ”تمھارا ذہن تمھاری سواری کا جانور ہے اسے اعتدال کے ساتھ استعمال کرو“۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت برصغیر کی تعلیمی حالت

مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ خطہ جہالت اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آریاؤں کی آمد کے بعد یہاں کا معاشرہ معزز اور ذلیل ذاتوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ تعلیم و تعلّم پر صرف برہمن کی اجارہ داری تھی۔ حتیٰ کہ کھشتری اور ویش بھی تعلیم و تدریس کے شعبوں میں برہمنوں کے ساتھ شریک نہ تھے۔ شودر پیدائشی طور پر کمتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کام دوسرے طبقوں کی خدمت کرنا تھا۔ تعلیم کے دروازے ان پر بند تھے۔ اسلامی تعلیمات میں عدل وانصاف اور انسانی مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے مسلمان جہاں بھی پہنچے مقامی آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی علم دوستی اور ان کی اعلیٰ معاشرتی اقدار کے نتیجے میں اسلام میں داخل ہوگئی۔ یہاں کا ہندو معاشرہ بھی مسلمانوں کی ان اعلیٰ روایات سے متاثر ہوا اور ان میں بھی عمومی تعلیم کا تصور فروغ پا گیا۔

برصغیر کے مسلمان حکمران، علما اور امرا حتیٰ کہ عوام بھی اسلام کے ہمہ گیر تصور تعلیم سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ مسلمان حکمران عموماً خود بڑے عالم اور فاضل تھے۔ علاؤالدین خلجی اور اکبر جیسے حکمران جو خود عالم نہ تھے وہ بھی تعلیم کے فروغ میں بہت فراخ دل تھے۔ انھوں نے بھی تعلیم کی اشاعت کے لیے مسجدیں اور مدارس تعمیر کرائے۔ اساتذہ اور طلبہ کے لیے وظائف مقرر کیے اور ممکن حد تک تعلیمی سہولتیں مہیا کیں جس سے برصغیر میں تعلیم عام ہوگئی۔

برصغیر میں نظام تعلیم کے نمایاں پہلو

برصغیر میں مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں اشاعت تعلیم کے لیے جو اقدامات کیے ان کے انمٹ نقوش یہاں کی سیاسی، سماجی

اور معاشرتی زندگی پر ثبت ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں جاہل اوران پڑھ ہونا بہت بُری بات تھی۔ بڑی بڑی بستیوں اور قصبوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے کئی کئی مدرسے ہوتے تھے جہاں دینی علوم یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ کے علاوہ شاعری، صرف ونحو اور تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلمان حکمرانوں کی علمی سرپرستی کا سلسلہ انگریزوں کے اقتدار پر قابض ہونے تک قائم رہا۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضے کے بعد مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو بہت نقصان پہنچایا جو ایک الگ موضوع ہے۔ ذیل میں ہم مسلمانوں کے نظام تعلیم کے جن نمایاں پہلوؤں کا جائزہ لیں گے ان میں مقاصدِ تعلیم، نصابِ تعلیم، حکمت تدریس، نظم ونسق اور امتحانات شامل ہیں۔

مقاصد تعلیم

مقاصد تعلیم کو نظام تعلیم میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام کی نظر میں تعلیم وتعلم کا اصل مقصد رضائے الٰہی اور اخلاق حسنہ کی تکمیل ہے اور علم کی روشنی سے جہالت کے اندھیرے کو دُور کرنا ہے۔ برصغیر کے مسلمان حکمرانوں اور علمائے کرام کی اشاعت تعلیم میں دلچسپی کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ایک طرف ہمایوں جیسے بادشاہ اور فتح اللہ شیرازی جیسے وزیر کو تعلیم وتدریس میں مشغول پاتے ہیں تو دوسری طرف ہزاروں علما ومشائخ کو اپنے دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ اس فرض کی ادائیگی کرتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک تعلیم کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

i- رضائے الٰہی کا حصول

حصول رضائے الٰہی مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے: ''جس نے اس علم، جس سے اللہ کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے، اس لیے حاصل کیا کہ وہ اس سے اپنی کوئی (دنیوی) غرض حاصل کرے تو قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا''۔

برصغیر پاک وہند میں ان لوگوں کے علاوہ جنھوں نے تعلیم کو بطور پیشہ اختیار کیا، بے شمار لوگ ایسے تھے جن کی معاشی مشغولیتیں اور تھیں لیکن مذکورہ بالا حدیث کے مطابق جو کچھ انھوں نے سیکھا محض رضائے الٰہی کے لیے دوسروں کو سکھانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ برصغیر کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی مسجدوں اور خانقاہوں کے علاوہ لوگوں نے گھروں پر بھی بغیر کسی دنیوی لالچ اور معاوضے کے مدارس قائم کیے ہوئے تھے۔ اہل علم کے علاوہ ہندوستان کے حکمران طبقہ نے بھی یہی مقصد سامنے رکھتے ہوئے تعلیم کو عوام الناس تک پہنچایا۔

ii- تعمیر سیرت وکردار

اسلامی مقاصد تعلیم میں تعمیر سیرت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم نے خدائی انعامات کی خوشخبری ان لوگوں کو دی ہے جو ایمان لانے کے ساتھ ساتھ نیک کام بھی کرتے ہیں۔ اسلام نے تربیت اخلاق کو تعلیم کا لازمی جز قرار دیا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں بھی علما وصوفیا نے تعلیم کے ذریعے اپنے طلبہ کے کردار کی تعمیر کی اور ان میں اچھے اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ خود بھی اچھے کردار کا عملی نمونہ تھے۔ اسلامی نظامِ تعلیم فرد کی شخصیت کی تعمیر کو بنیادی اہمیت دیتا ہے تاکہ صالح افراد مل کر صالح معاشرہ تشکیل دے سکیں اور اجتماعی زندگی کے وظائف احسن طریقے سے انجام دیں۔

iii- متوازن نشوونما

تعلیم کسی ایک انسانی پہلو کی نشوونما کا عمل نہیں بلکہ اس کے ذریعے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی متوازن نشوونما کا کام

لیا جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے اپنے مدارس میں جو تعلیمی نظام رائج کیا اس میں طلبہ کی ہمہ پہلو نشوونما کا خیال رکھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے سامنے تعلیم کا تصور بہت وسیع تھا۔ گو دینی تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی لیکن تجارت اور فنون سپاہ گری کے لیے بھی ادارے قائم تھے۔ تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ مدارس میں ایک طرف قرآن وحدیث، فقہ، منطق اور کلام کی تعلیم دی جاتی تھی تو دوسری طرف تاریخ، جغرافیہ، طبعیات اور علم ہندسہ کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔

iv- معاشی خود کفالت

اسلامی نظام تعلیم میں اس بات کو اہمیت حاصل رہی ہے کہ طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی روزی بھی کما سکیں۔ برصغیر کے نظام تعلیم میں ایسے فنون بھی شامل تھے جو طالب علم کی خود کفالت کے ضامن سمجھے جاتے تھے مثلاً خطاطی، کتابت، جلد سازی وغیرہ۔ برصغیر میں ایسے مدارس کا ذکر بھی ملتا ہے جہاں فنی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔

v- منصبِ خلافت

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اللہ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ ہونے کا شرف بخشا ہے۔ اس لیے مسلمان کی زندگی کا ایک مقصد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا قیام ہے۔ تعلیم انسان کو اس مقصد کی ادائیگی کے لیے تیار کرتی ہے۔

vi- تسخیرِ کائنات

تعلیم کا ایک مقصد انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں اور پوشیدہ ذرائع کو انسان کی بھلائی کے لیے استعمال کر سکے۔

نصاب تعلیم

ابتدا میں اسلامی مدارس کے نصاب میں قرآن حکیم کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ علاوہ ازیں تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ بھی اسلامی نظام تعلیم کا حصہ تھے جبکہ دیگر علوم حساب، طب، نجوم اور زراعت وغیرہ کی تحصیل اختیاری مضامین کی سی تھی۔ طلبہ کو اپنی دلچسپی کے مطابق مضامین کے انتخاب کی آزادی تھی جبکہ قرآن حکیم کی تعلیم کو مرکزی مقام حاصل رہا۔ کئی علوم قرآن پاک کی تفہیم کے لیے نصاب میں شامل ہوتے گئے۔

قرآن پاک نے سیروفی الارض اور مشاہدہ کائنات کی بار بار تاکید کی ہے۔ مشاہدہ کائنات کی تاکید سے سائنسی علوم کو ترقی ملی اور یہ نصاب کا حصہ بن گئے۔ قرآن پر اعتراضات کے جوابات دینے کے لیے فلسفیانہ علوم خاص طور پر علم الکلام وجود میں آیا۔ اسلام میں معرفت نفس کی تاکید کی گئی ہے۔ نفس کی معرفت کے تقاضے نے علم نفسیات کی شکل اختیار کی۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے عربی زبان وادب کو ترقی حاصل ہوئی۔ برصغیر کے نصاب تعلیم میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس کا جائزہ مختلف اَدوار کے حوالے سے لیا جائے گا۔

ابتدائی تعلیم کا نصاب

ابتدائی تعلیم کے نصاب میں معمولی پڑھنا لکھنا اور ابتدائی حساب سکھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مذہب اسلام کے وہ ابتدائی اصول بھی بتائے اور یاد کرائے جاتے تھے جو ضروری ہیں۔ چونکہ اس دَور میں مسلمان عوام کی زبان عام طور پر فارسی تھی اس لیے مکاتب میں

فارسی ہی ذریعہ تعلیم تھا۔ ابتدائی تعلیم کے نصاب کا لازمی جزو کلام اللہ تھا۔ اس کے علاوہ فارسی کی کتابیں گلستان اور بوستان وغیرہ نصاب میں شامل تھیں۔ مکاتب میں عموماً مسلمان اور غیر مسلم لڑکے لڑکیاں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ قرآن مجید کی تعلیم مسلمان بچوں کے لیے لازمی تھی۔ ابتدائی تعلیم کی مدت متعین نہ تھی۔ طالب علم مقررہ نصاب کی تکمیل کے بعد اگلے درجہ کی تعلیم شروع کر سکتا تھا۔

ثانوی تعلیم کا نصاب

ثانوی سطح کے نصاب میں زبان وادب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی کی ضروریات سے متعلقہ مضامین مثلاً دفتری و قانونی امور کی تعلیم بھی نصاب میں شامل تھی۔ نصاب میں ادب وانشا، حساب، تاریخ، اخلاقیات، فقہ اور خوشنویسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ثانوی سطح پر فارسی زبان ذریعہ تعلیم تھی لیکن عربی زبان وادب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی تاکہ جو طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں دقت محسوس نہ کریں۔ ثانوی درجہ کی تعلیم کے بعد طالب علم سرکاری ملازمت کے اہل ہوتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم کا نصاب

اعلیٰ تعلیم کے درجے کے نصاب میں عربی زبان وادب، تفسیر، حدیث وفقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، علم الکلام، تصوف اور علم ہیئت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اعلیٰ سطح پر عربی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد طلبہ اپنی قابلیت کے مطابق پیشہ اختیار کرتے تھے۔ قاضی کے منصب پر فائز ہوتے یا شاہی درباروں میں مختلف عہدے حاصل کرتے تھے لیکن درس وتدریس کے پیشہ سے منسلک ہونے والوں کو اس زمانے میں سب سے زیادہ عزت حاصل ہوتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے نصاب کا جائزہ لینے کے لیے برصغیر میں سلاطینِ دہلی کے زمانے سے لے کر اورنگ زیب عالم گیر تک کے زمانے کو تین اُدوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا دَور

پہلا دور مسلمانوں کے تعلیمی نظام کے آغاز سے لے کر عہد اکبری سے قبل تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور میں عربی زبان وادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، کلام اور تصوف شامل نصاب تھے۔ یہ دور کوئی دو سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔

دوسرا دور (عہد اکبری سے درس نظامی کے آغاز تک)

پہلے دور میں سکندر لودھی کے زمانے میں فلسفہ ومنطق کی طرف رجحان ہوا تھا دوسرے دور میں اسے مزید ترقی ہوئی۔ عہد اکبری مذہبی آزادی کا دور تھا۔ اس دور میں فتح اللہؒ شیرازی اکبری دربار سے وابستہ ہوئے اور انھیں ان کے علم کی بنا پر عضد الملک کا خطاب دیا گیا۔ فتح اللہؒ شیرازی نے سابقہ نصابِ تعلیم میں کچھ اضافے کیے جنھیں مسلمان علما نے قبول کرلیا۔ دوسرا دور ان تبدیلیوں سے شروع ہوا۔ فلسفہ، منطق اور علم الکلام کی کتابوں کا نصاب میں اضافہ ہوتا رہا اور اس طرح نصاب کا منقولات سے معقولات کی طرف رجحان زیادہ ہوگیا۔ اسی دور میں ایک نئے مضمون طب کا بھی اضافہ ہوا۔

تیسرا دور (درس نظامی)

اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں ملا نظام الدینؒ سہالوی نے دور اکبری کے نصاب میں ترامیم اور اضافے کر کے ایک نیا نصاب تعلیم ترتیب دیا جسے "درسِ نظامی" کے نام سے برصغیر کے کم وبیش تمام مدارس میں رائج کیا گیا۔ اس دور میں منقولات کی بجائے معقولات کی طرف مزید جھکاؤ ہوا۔ ملا نظام الدینؒ نے نصاب میں مزید کتابوں کا اضافہ کیا۔ نصاب میں کتابوں کا یہ اضافہ بھی اسی اصول پر کیا گیا

جو فتح اللہ شیرازیؒ نے قائم کیا تھا یعنی معقولات کی کتابوں میں اضافہ کرنا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ نقلی علوم بے توجہی کا شکار ہو گئے اور انھیں اسلامی مدارس میں وہ مقام حاصل نہ رہا جس کے وہ مستحق تھے۔ ملا نظام الدینؒ نے نصابی کتب کے چناؤ کے لیے یہ اصول بنایا کہ ہر علم وفن کی مشکل سے مشکل کتاب طلبہ کے مطالعہ میں آئے۔

درس نظامی کے رائج ہونے سے نقلی علوم جس بے توجہی کا شکار ہوئے تھے اس کا ازالہ کرنے کے لیے شاہ عبدالرحیم نے مدرسہ رحیمیہ دہلی میں قرآن وحدیث کو دوبارہ نصاب میں مرکزی حیثیت دینے کی تحریک شروع کی اور ان کے بعد ان کے فرزند شاہ ولی اللہؒ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ درس نظامی کے نصاب میں جو خامیاں تھیں ان پر صحت مندانہ تنقید کرتے ہوئے قرآن وحدیث کے علم کو ترقی دی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اس تحریک کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

درس نظامی کی خصوصیات

درس نظامی کا آغاز آج سے قریباً چار سو سال قبل اورنگ زیب کے عہد میں ہوا لیکن آج بھی یہ نصاب ہمارے بہت سے دینی مدارس میں بعض تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ اپنی کئی ایک خصوصیات کی بنا پر رائج ہے۔ درس نظامی کے نصاب کی چند اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

- i- اس نصاب میں فلسفہ اور منطق وغیرہ کی نسبت قرآن وحدیث پر توجہ کم تھی۔
- ii- نصاب میں تاریخ اور جغرافیہ جیسے اہم مضامین شامل نہیں تھے۔
- iii- صرف ونحو کی کئی کتابیں نصاب میں شامل تھیں۔
- iv- درس نظامی کے نصاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قوت مطالعہ قوی ہو جاتا ہے۔
- v- درس نظامی کے نصاب میں معلومات کی وسعت کی بجائے فہم وتدبر اور سوچ وبچار پر زیادہ زور دیا گیا۔

درس نظامی کے نصاب کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس دور میں نصاب کو پیچیدہ اور مشکل بنا دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم میں منقولات کی نسبت معقولات زیادہ اہمیت اختیار کر گئے۔ یہ نصاب آج کل بھی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے لیکن ملا نظام الدینؒ کے بنائے گئے نصاب اور آج کل کے درس نظامی کے نصاب میں بہت فرق ہے۔ آج کل بہت سی ایسی کتابیں نصاب میں شامل ہیں جو ملا نظام الدینؒ کے عہد میں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ متعدد کتابیں جو اس وقت نصاب میں شامل تھیں آج کل ختم کر دی گئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے باوجود درس نظامی کا نصاب جمود کا شکار ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے رہا۔

تدریسی طریقے

تعلیم کے مختلف مدارج کے لیے درج ذیل تدریسی طریقے استعمال کیے جاتے تھے:

ابتدائی تعلیم

بچوں کو ابتدائی تعلیم مکاتب میں دی جاتی تھی۔ تعلیم کی ابتدا رسم بسم اللہ کی تقریب سے ہوتی تھی۔ جب بچہ چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہو جاتا تو بچے کو استاد کے سپرد کیا جاتا تھا۔ استاد بچے کے عزیزوں اور رشتہ داروں کی موجودگی میں بسم اللہ، سورۃ علق کی ابتدائی آیات اور سورۃ فاتحہ بچے کو پڑھاتا تھا۔ اس کے بعد بچے کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان مکاتب میں بچوں کو

قرآن کریم، معمولی پڑھنا لکھنا اور ابتدائی حساب سکھایا جاتا تھا۔ بچوں کو حروف تہجی اور ان کی مختلف صورتوں کی پہچان کرانے کے بعد حروف کو ملا کر پڑھنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ حروف کی پہچان کے بعد لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ اکبر نے اپنے دور میں لکھنا پڑھنا ایک ساتھ شروع کرنے کو رواج دیا۔ چنانچہ حروف تہجی لکھنے کے ساتھ ہی ان کی شکلیں اور نام یاد کرائے جاتے اور مسلسل مشق کے بعد بچے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کے قابل بھی ہو جاتے تھے۔

ثانوی اور اعلیٰ درجات میں تدریسی طریقے

ثانوی اور اعلیٰ درجوں میں عام طور پر مندرجہ ذیل تدریسی طریقے رائج تھے۔

☆ تقریری طریقہ ☆ درسی کتاب کا طریقہ

☆ بحث و مباحثہ کا طریقہ ☆ گہرا مطالعہ

تقریری طریق تدریس (Lecture Method)

تقریری طریقہ بہت قدیم ہے اور ہندوستان کے قریباً تمام مدارس میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یہ طریقہ رائج تھا۔ اساتذہ مضمون کے بارے میں طلبہ کو لیکچر دیتے تھے اور طلبہ اہم نکات لکھ لیتے تھے۔ استاد درس کے حلقہ میں کسی اونچے مقام یا مسند پر بیٹھتا تھا اور درس کے بعد طلبہ سوالات کے ذریعے مشکل اور پیچیدہ باتوں کو دوبارہ سمجھ لیتے تاکہ کوئی خلش باقی نہ رہے۔ معلم بھی اپنی تدریس کا جائزہ لینے کے لیے پڑھائے گئے مواد سے سوالات پوچھتے تھے۔

درسی کتاب کا طریقہ (Textbook Method)

اس طریقہ تدریس میں اساتذہ کتاب کی قرأت کرتے تھے اور طلبہ انھیں غور سے سنتے تھے۔ بعض اوقات طلبہ قرأت کرتے تھے اور استاد غلطیاں درست کرتے جاتے تھے اور عبارت کے مشکل مقامات کی تشریح بھی کرتے جاتے تھے۔ دوران قرأت اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے اساتذہ سے سوالات بھی کرتے تھے چونکہ طلبہ پڑھائے جانے والے سبق کا باقاعدہ مطالعہ کرکے آتے تھے اس لیے ان کے سوالات بڑے جامع اور موضوع کے مطابق ہوتے تھے۔

گہرے مطالعہ کا طریقہ (Deep Study Method)

اس طریقہ میں استاد کے سبق پڑھانے سے پہلے طالب علم سبق کا خود مطالعہ کرتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ عبارت اور ترجمہ کی جانب توجہ کی جاتی، سبق میں جو نئے الفاظ آتے لغت کی مدد سے ان کے معنی دیکھے جاتے اور مطلب سمجھنے کی کوشش کی جاتی اگر ایک دفعہ مطالعہ سے مسئلہ حل نہ ہوتا تو دوسری اور تیسری بار کوشش کی جاتی اور صرف وہی مسائل اساتذہ کے سامنے پیش کیے جاتے جو طلبہ کوشش کے باوجود خود حل نہ کر سکتے تھے۔ گہرے مطالعے کا یہ طریقہ کار آج بھی اعلیٰ درجے کے سنجیدہ طلبہ کے لیے بہترین ہے۔

بحث و مباحثہ کا طریقہ (Discussion Method)

دوران تدریس سوالات اور جوابات ایک لازمی اور ضروری چیز ہے۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں بحث و مباحثہ کے طریقے کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اس طریقہ میں معلم پڑھانے کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آتا تھا اور دوسری طرف طلبہ بھی محض خاموش سامع نہیں رہتے تھے۔ بلکہ پوری طرح سبق میں شرکت کرتے تھے۔ بعض اوقات سوالات و جوابات کا یہ سلسلہ مباحثہ کی شکل اختیار

کر کے گھنٹوں میں ختم ہوتا تھا۔ مشہور اساتذہ کے درس میں ہم عصر علما بھی شرکت کرتے تھے، اس طرح بحث ومباحثہ کا معیار بہت بلند ہوتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یہ طریقہ نہایت کامیاب تھا۔

مانیٹوریل سسٹم

ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم میں مانیٹوریل سسٹم بھی رائج تھا۔ اس سسٹم کے تحت اعلیٰ درجے کے طالب علم اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں اپنی پڑھی ہوئی کتابیں چھوٹی جماعت کے طلبہ کو پڑھاتے تھے اور نظم ونسق کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی تھی۔ یہ طریقہ بہت کامیاب اور مفید ثابت ہوا۔ اس طریقہ سے معلم کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں آسانی ہوتی تھی اور وہ طلبہ جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا فرض بھی ادا کرتے تھے ان میں انتظامی صلاحیتیں پروان چڑھتی تھیں اور قابلیت میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔

مانیٹوریل سسٹم میں بعض اوقات استاد کی تدریس کے ساتھ ہی ایک طالب علم باآواز بلند سبق دُہراتا تھا۔ مولانا شبلیؒ اس بارے میں لکھتے ہیں۔ ''اس زمانے میں نامور علما کے ہاں دستور تھا کہ جب وہ درس دے چکتے تو شاگردوں میں سے جو سب سے زیادہ لائق ہوتا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا اور استاد کے پڑھائے ہوئے مضامین کو اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا۔ یہ منصب جس طالب علم کو حاصل ہوتا اسے ''معید'' کہتے تھے۔''

جائزہ

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کے دور میں جائزے کا نظام اس قدر ترقی یافتہ نہ تھا جو آج کے دور میں پایا جاتا ہے لیکن اساتذہ تعلیمی مقاصد کے پیش نظر اپنے شاگردوں کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ لے کر انھیں اگلے درجے میں ترقی دیتے تھے۔ ایک درجہ پاس کرنے کے لیے کوئی خاص مدت مخصوص نہ تھی۔ ابتدائی تعلیم میں آموختہ کا طریقہ رائج تھا۔ چھوٹے بچوں کو جو سبق دیا جاتا معلم اسے سن کر اگلا سبق پڑھنے کی اجازت دیتا تھا۔

معلم ہفتہ میں ایک دن ''آموختہ'' سننے کے لیے مقرر کرتا تھا یعنی ابتدائی تعلیم میں جس چیز کا جائزہ لیا جاتا تھا وہ حافظہ تھا اور اس طرح یہ معلوم کیا جاتا تھا کہ بچوں نے کس قدر سبق یاد رکھا ہے۔

اعلیٰ تعلیم میں دوران تدریس سوالات وجوابات، بحث ومباحثہ اور مذاکرے ومناظرے جائزے کے مقاصد کو پورا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں امتحانات کا وہ ڈراؤنا اور تباہ کن تصور نہ تھا جو آج کل کے طریقہ امتحانات سے وابستہ ہے۔ استاد آزمائشی سوالات پوچھتا تھا جس کے ذریعے طلبہ کی قابلیت کا اندازہ ہوتا رہتا تھا۔ استاد اور شاگرد کے درمیان گہرا رشتہ رہتا تھا جو جائزہ میں بہت مفید ثابت ہوتا تھا۔ اعلیٰ درجے کی تعلیم کے اختتام پر طلبہ کو سندِ فضیلت دی جاتی تھی۔

سلاطین دہلی اور مغلیہ عہد میں سالانہ امتحانات کا طریقہ رائج نہ تھا لیکن طلبہ کی تعلیمی ترقی کی پیمائش باقاعدہ ہوتی رہتی تھی۔ جائزے کے علاوہ ہمیں برصغیر کی تعلیمی تاریخ میں رسمی امتحانات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ والئ بیجاپور محمد عادل شاہ نے سالانہ امتحانات کا طریقہ رائج کیا۔ یہ امتحانات ذی الحجہ کے مہینے میں ہوتے تھے اور اچھی کارکردگی پر طلبہ کو انعامات دیے جاتے تھے۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کے عہد میں جائزے کا باقاعدہ طریقہ نہ ہونے کے باوجود، سرکاری ملازمتوں اور درباری مناصب حاصل کرنے کے لیے مقابلے کی فضا موجود تھی۔ مختلف سرکاری مناصب کے لیے امیدوار عملی طور پر اپنی قابلیت ثابت کرتے تھے۔

نظم ونسق

برصغیر میں مسلمان حکمرانوں کے عہد میں اکثر تعلیمی ادارے اہل علم ہی کی کوششوں سے قائم تھے جو اپنے طور پر یا اہل ثروت کی سرپرستی سے ان تعلیمی اداروں کا انتظام چلاتے تھے۔ بادشاہ اور حکمران طبقہ بھی ان تعلیمی اداروں کی علمی و مالی اعانت اور سرپرستی کرتا تھا لیکن ان تعلیمی اداروں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ انھیں داخلی طور پر خود مختاری حاصل تھی۔ علما اور اساتذہ ان تعلیمی اداروں کے نصاب، طریق تدریس، طریقہ امتحانات اور دیگر امور میں آزاد تھے۔ انتظامی لحاظ سے برصغیر میں مسلمانوں کے دور میں مختلف قسم کی درس گاہیں تھیں۔ درس گاہوں کی چند قسمیں مندرجہ ذیل ہیں:

- ☆ سرکاری مدارس
- ☆ مساجد میں قائم مدارس
- ☆ خانقاہوں اور مزارات سے ملحق مدارس
- ☆ علمائے کرام کے قائم کردہ ذاتی مدارس

قدیم ہندوستان کا تعلیمی نظام داخلی طور پر آزاد اور خود مختار تھا۔ نجی اور شخصی تعلیمی ادارے تو ایک طرف، سرکاری سطح پر قائم کیے گئے مختلف تعلیمی اداروں کے نظم ونسق کی پالیسی میں بھی یکسانیت نہ تھی بلکہ ان مدارس کے علما اور اساتذہ نظم ونسق کے سلسلے میں آزاد اور خود مختار رہتے تھے۔ یعنی نظم ونسق کے سلسلے میں مرکزیت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ مدارس میں داخلے کے لیے کسی قسم کی شرائط نہ تھیں۔ تعلیم کے لیے عمر کی کوئی پابندی نہ تھی۔ عربی مدارس میں داخلے عموماً شوال کے مہینے میں ہوتے تھے۔ اوقات تعلیم میں کوئی باقاعدگی نہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں باہمی رابطے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس کے باوجود نصاب، طریقہ تدریس اور اوقات تعلیم میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ تعلیم کے مختلف درجات کے لیے مدت کا تعین نہ تھا۔ طالب علم ایک درجہ کا نصاب ختم کرنے کے بعد دوسرے درجے میں پہنچ جاتا تھا۔ طلبہ میں اساتذہ کے لیے حد درجہ احترام پایا جاتا تھا اور وہ اساتذہ کے ذاتی کام کرنے میں بھی خوشی اور راحت محسوس کرتے تھے۔ قدیم ہندوستان کے اسلامی مدارس کے نظم ونسق کا موازنہ آج کے ترقی یافتہ دور کے تعلیمی اداروں کے نظم ونسق سے کیا جائے تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ قدیم ہندوستان کے اسلامی مدارس کا نظم ونسق مثالی تھا۔ نظم ونسق کے مثالی ہونے کی سب سے بڑی وجہ طلبہ کے دل میں اساتذہ اور علم کا احترام تھا۔

انگریز کی آمد سے قبل برصغیر میں مسلمانوں کے دور کی علمی سرگرمیوں کے مطالعہ سے چند اہم خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ہر مسجد ابتدائی تعلیم کے مرکز کے طور پر کام کرتی تھی۔ تعلیمی سہولتیں یونیورسل تھیں اور مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ مفت رہائش کے علاوہ طلبہ کو وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ مقصد تعلیم رضائے الٰہی اور نیابت الٰہی کا حصول تھا۔ انگریز کی حکومت قائم ہونے کے بعد تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت کے لیے تیاری اور روزگار کا حصول قرار پایا۔ مسجدیں تعلیم کا مرکز نہ رہیں۔ محدود تعداد میں سکول کھولے گئے جس کے نتیجہ میں تعلیم محدود ہوگئی اور یونیورسل نہ رہی۔

مسلمانوں کے دور میں نظام تعلیم عوامی اور آزاد تھا۔ حکمران اپنا فرض سمجھتے ہوئے تعلیم کی ترقی پر بے پناہ رقم خرچ کرتے تھے مگر ان کے انتظامی معاملات اور نصاب میں قطعاً مداخلت نہیں کرتے تھے لیکن انگریزوں نے برسر اقتدار آتے ہی بلا تفریق مذہب سیکولر بنیادوں پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے یکساں نظام تعلیم رائج کیا تاکہ ایک مخصوص ذہنیت پیدا کی جاسکے جس سے مغربی افکار کی اشاعت ممکن ہوجائے۔

انگریزی دور میں اُردو اور فارسی کی جگہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور مخلوط تعلیم کو رواج دیا گیا اور مجموعی تعلیمی ماحول ایسا بنا دیا گیا کہ مسلمان جو پچاس فیصد سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے ان میں خواندگی کی شرح کم ہوتے ہوتے پاکستان کے قیام تک 20 فیصد کی سطح سے بھی نیچے آ چکی تھی۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے پاکستان بے شمار قدرتی ذرائع اور وسائل کے باوجود معاشی اور معاشرتی طور پر دنیا میں بہت پست مقام تک پہنچ چکا ہے۔ معاشی اور معاشرتی بہتری اور ملکی ذرائع اور وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے آزادانہ اور یونیورسل ایجوکیشن بہت ضروری ہے۔

اہم نکات

1- مسلمانوں کے نظام تعلیم میں مکتب و مدرسہ کا کردار بڑا اہم رہا ہے۔

2- تعلیم کے مختلف مدارج کے لیے مختلف تدریسی طریقے رائج تھے جن میں تقریری طریقہ (Lecture Method)، درسی کتاب کا طریقہ (Textbook Method)، بحث و مباحثہ کا طریقہ (Discussion Method)، گہرا مطالعہ کا طریقہ (Deep Study Method) شامل ہیں۔

3- برصغیر میں مسلمانوں کے مدارس کا انتظام مختلف اداروں کے پاس تھا جیسے سرکاری مدارس اور خانقاہوں سے ملحق مدارس وغیرہ۔

4- امام الغزالیؒ کے نزدیک حقیقت تک رسائی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ وحی کے ذریعے حاصل کیا ہوا علم سچا اور حقیقی ہے۔

5- ابن خلدون کے خیال کے مطابق حصول تعلیم بھی فطرت انسانی کا ایک تقاضا ہے۔ انسانی فطرت میں سیکھنے کی صلاحیت ہی تعلیم کی بنیاد ہے۔

6- ابن سینا عقل اور منطقی استدلال کو علم کے حصول کا صحیح ترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ عقل ہی حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کو منظم صورت میں پیش کرتا ہے۔

7- علامہ زرنوجی نے رضائے الٰہی کے حصول اور آخرت میں کامیابی کو تعلیم کے حصول کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا ہے۔ وہ نصاب میں قرآن، حدیث، فقہ و اصول اور طب جیسے مضامین شامل کرتے ہیں۔

آزمائشی مشق (حصہ معروضی)

I- ہر بیان کے ساتھ چار جوابات دیے گئے۔ صحیح جواب پر (✓) کا نشان لگائیں:

i- انسانی تعلیم کا آغاز ہوا:

ا۔ حضرت آدمؑ کی پیدائش سے　　ب۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے

ج۔ حضرت نوحؑ کی پیدائش سے　　د۔ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش سے

ii- مکتب اور مدرسہ کے ذریعہ تعلیم کا آغاز کیا:

ا۔ مسلمانوں　　ب۔ یہودیوں　　ج۔ عیسائیوں　　د۔ ہندوؤں

iii- یورپ کی یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کا تیار کردہ نصاب پڑھایا جاتا رہا:

ا۔ پندرھویں صدی تک　　ب۔ سولھویں صدی تک

ج۔ سترھویں صدی تک　　　د۔ اٹھارھویں صدی تک

iv- اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا حکم صادر فرمایا:

ا۔ پہلی وحی میں　　ب۔ دوسری وحی میں　　ج۔ تیسری وحی میں　　د۔ چوتھی وحی میں

v- اسلامی مدارس کے نصاب میں ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے:

ا۔ طب کو　　ب۔ ریاضی کو　　ج۔ زراعت کو　　د۔ قرآن کو

vi- برصغیر کے مکاتب میں ذریعہ تعلیم تھا:

ا۔ عربی　　ب۔ فارسی　　ج۔ ہندی　　د۔ سنسکرت

vii- برصغیر میں ابتدائی تعلیم کی مدت تھی:

ا۔ چار سال　　ب۔ پانچ سال　　ج۔ چھ سال　　د۔ غیر معینہ

viii- درس نظامی کا نصاب ترتیب دیا:

ا۔ اورنگ زیب نے　　ب۔ ملا نظام الدین سہالوی نے　　ج۔ شاہ ولی اللہ نے　　د۔ فتح اللہ شیرازی نے

ix- درس نظامی کے نصاب میں معلومات کی وسعت کی بجائے زیادہ زور دیا گیا:

ا۔ قرآن پر　　ب۔ حدیث پر　　ج۔ ریاضی پر　　د۔ فلسفہ و منطق پر

x- برصغیر میں بچوں کو مکاتب میں داخل کیا جاتا تھا:

ا۔ چار سال چار ماہ کی عمر میں　　ب۔ پانچ سال چار ماہ کی عمر میں

ج۔ چھ سال چار ماہ کی عمر میں　　د۔ سات سال چار ماہ کی عمر میں

II- درج ذیل میں خالی جگہ مناسب الفاظ سے پُر کریں:

i- اسلامی تاریخ میں............کو پہلے باقاعدہ مدرسہ کی حیثیت حاصل ہے۔

ii- مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں............تک طلبہ کے ایک ہی وقت میں قیام پذیر ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

iii- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت............کے گھر سے صحابہ کرامؓ کو تعلیم دینے کی ابتدا کی۔

iv- حضرت............نے باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے علما اور اساتذہ کی تنخواہیں مقرر فرمائیں۔

v- امام غزالیؒ نظامیہ بغداد کے............مقرر ہوئے۔

vi- ابتدائی تعلیم کے مدارس کے لیے............کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔

vii- مستنصر باللہ نے 1233ء میں اعلیٰ درجے کی ایک درسگاہ بنوائی جسے جامعہ............کہتے تھے۔

viii- دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی............ہے۔

ix- علاؤالدین خلجی اور اکبر جو خود عالم نہ تھے وہ بھی .... کے فروغ میں بہت فراخ دل تھے۔

x- اسلامی مقاصد .... میں تعمیر سیرت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

III- صحیح بیان کی صورت میں ''ص'' اور غلط بیان کی صورت میں ''غ'' کے گرد دائرہ لگائیے:

i- جامعہ ازہر چھٹی صدی عیسوی میں قاہرہ میں قائم ہوئی۔ ص/غ

ii- برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت تعلیم و تعلم پر صرف برہمن کی اجارہ داری تھی۔ ص/غ

iii- برصغیر کے مسلمان حکمران عموماً خود بڑے عالم اور فاضل تھے۔ ص/غ

iv- انگریزوں نے برصغیر پر قابض ہونے کے بعد مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو بہت ترقی دی۔ ص/غ

v- تعلیم کے ذریعے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی نشوونما ممکن نہیں۔ ص/غ

vi- قرآن پاک پر اعتراضات کے جوابات دینے کے لیے فلسفیانہ علوم خاص طور پر علم الکلام وجود میں آیا۔ ص/غ

vii- برصغیر میں معمولی پڑھنا لکھنا اور ابتدائی حساب ابتدائی تعلیم کے دوران سکھایا جاتا تھا۔ ص/غ

viii- برصغیر کے مکاتب میں عموماً مسلمان اور غیر مسلم لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ص/غ

ix- برصغیر میں ابتدائی تعلیم کی مدت متعین نہ تھی۔ ص/غ

x- درس نظامی میں معقولات کی بجائے منقولات کی طرف زیادہ جھکاؤ ہوا۔ ص/غ

IV- کالم (ا) کو کالم (ب) سے ملائیں اور جواب کالم (ج) میں لکھیں:

	کالم (ا)	کال (ب)	کالم (ج)
i-	ملا نظام الدین سہالوی نے ایک نیا نصاب ترتیب دیا۔	قرآن پاک نے	
ii-	اس سسٹم کے تحت اعلیٰ درجات کے طالب علم زمانہ طالب علمی ہی میں اپنی پڑھی ہوئی کتابیں چھوٹی جماعت کے طلبہ کو پڑھاتے تھے۔	حضرت آدمؑ	
iii-	سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ اور مشاہدہ کائنات کی بار بار تاکید کی ہے۔	درس نظامی	
iv-	ان کا نظریہ تھا کہ انسان سیکھنے پر مجبور ہے۔	ابن خلدون	
v-	ان کا خیال ہے کہ تعلیم کا آغاز مادری زبان سے کیا جائے۔	ابن سینا	
vi-	آپ کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔	ابن خلدون	
vii-	آپ نے طلبہ کی رہنمائی کے لیے ''تعلیم المتعلم'' لکھی۔	علامہ زرنوجی	
viii-	اللہ تعالیٰ نے ان کو اشیا کے استعمال کا سائنسی علم سکھایا۔	مکاتب	
ix-	ان میں ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا تھا۔	مدارس	
x-		مانیٹوریل سسٹم	

V- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے:

i- مکتب اور مدارس کا نظام تعلیم کیا تھا؟

ii- جامعات سے کیا مراد ہے؟

iii- برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت تعلیمی حالت کیا تھی؟

iv- برصغیر میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں مقاصد تعلیم کیا تھے؟

v- مسلمانوں کے عہد حکومت میں برصغیر کا ابتدائی تعلیم کا نصاب کیا تھا؟

vi- مسلمانوں کے عہد حکومت میں برصغیر کا ثانوی تعلیم کا نصاب کیا تھا؟

vii- مسلمانوں کے عہد حکومت میں برصغیر کا اعلیٰ تعلیم کا نصاب کیا تھا؟

viii- درس نظامی کی خصوصیات لکھیے۔

ix- مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیے:

ا۔ گہرے مطالعہ کا طریقہ　　ب۔ بحث ومباحثہ کا طریقہ　　ج۔ مانیٹوریل سسٹم

x- مسلمانوں کے نظام تعلیم میں قرآن کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔نوٹ لکھیے۔

xi- فرض عین اور فرض کفایہ کے بارے میں امام غزالیؒ کے خیالات کی وضاحت فرمائیں۔

xii- نقلی علوم اور عقلی علوم سے علامہ ابن خلدون کیا مراد لیتے ہیں؟

xiii- ''تعلیم انسان کی طبعی ضرورت ہے۔'' علامہ ابن خلدون کی اس سے کیا مراد ہے؟

xiv- ابن سینا نے علوم کو کون سے تین مدارج میں تقسیم کیا ہے؟

انشائیہ حصہ

VI- مسلمانوں کے عہد میں برصغیر میں جو تدریسی طریقے استعمال ہوتے تھے، ان پر نوٹ لکھیے۔

VII- برصغیر میں مسلم دور میں تعلیم کے مختلف مدارج کی تفصیل لکھیے۔

VIII- علامہ زرنوجی نے تعلیم المتعلم میں طلبہ اور اساتذہ کے لیے کیا ہدایات دی ہیں؟

IX- امام غزالیؒ کی تعلیمی فکر پر روشنی ڈالیے۔

X- ابن خلدون کی تعلیمی فکر کیا تھی؟ آج اس سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟

XI- ثابت کیجیے کہ ابن سینا ایک مفکر تعلیم تھے۔

جنوبی ایشیا میں برطانوی نظام تعلیم
(British Education System in Sub-Continent)

تعارف (Introduction)

انگریز مؤرخین اور ذمہ داران حکومت اس بات کے معترف ہیں کہ مسلمانوں کے دَور میں برصغیر میں تعلیم عام اور مفت تھی، معیار تعلیم بلند تھا اور تعلیمی سہولتیں وافر تھیں۔ سر تھامس منرو (Sir Thomas Munro) کی 25 جون 1822ء کی رپورٹ پہلی اہم دستاویز ہے جس میں اعتراف ہے کہ مدراس کے صوبے میں ہر پانچ سو افراد کی آبادی میں ایک سکول موجود تھا اور آبادی کے ایک تہائی لوگوں کو سکولوں کی سہولت دستیاب تھی۔ بمبئی میں تعلیم کی وسعت کے بارے میں آر۔ وی۔ پرولیکر (R.V. Prolekar) لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب اتنا ہی ہے جتنا یورپی ممالک میں ہے۔''

صوبہ بنگال اور بہار کی تعلیمی حالت کے متعلق سب سے زیادہ مفصل رپورٹ ایک عیسائی مبلغ ولیم آدم (William Adam) نے تیار کی۔ رپورٹ کے مطابق انگریزی حکومت کے آغاز کے وقت صوبہ بنگال اور بہار میں پانچ سے دس سال کی عمر کے بچوں کے لیے ایک لاکھ سکول موجود تھے جن میں پڑھنے لکھنے اور ابتدائی حساب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پنجاب کے متعلق مسٹر آرنلڈ (Mr. Arnold) اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ ''تعلیم یہاں عام ہے۔ مسلمان ہندو اور سکھ سبھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ البتہ اساتذہ سب مسلمان ہیں۔ بیشتر اساتذہ بغیر کسی معاوضہ کے تعلیم دیتے ہیں۔ یہ مدارس اوقاف کی آمدنی سے چل رہے ہیں۔ لڑکیوں کے لیے جداگانہ سکول ہیں''۔ سر ولیم ہنٹر (Sir William Hunter) نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق لکھا ہے کہ ''ملک پر ہمارے قبضہ سے پہلے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ علمی اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے۔ ان کا نظام تعلیم اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دیتا تھا اور یہ ہندوستان کے دیگر تمام تعلیمی نظاموں سے بدرجہا بہتر تھا۔''

ان مختلف رپورٹوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انگریزوں نے جس وقت برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کیا اس وقت مسلم نظام تعلیم اپنے عروج پر تھا۔ کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں کوئی مدرسہ موجود نہ ہو۔

انگریز برصغیر پاک و ہند میں تجارت کی غرض سے آئے اور بالآخر اس ملک کے حکمران بن گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت سے زیادہ ایک نمایاں سیاسی حیثیت اختیار کر لی۔ 1757ء میں جنگ پلاسی کے بعد یہ ایک حکمران طاقت بن کر ابھری۔ 1765ء میں مغل حکمران شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کا انتظام انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ یہیں سے برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی سیاسی اور تعلیمی حکمت عملی کا آغاز ہوتا ہے۔ کمپنی کی حکومت 1857ء تک قائم رہی۔ بعد ازاں 1858ء میں حکومت برطانیہ نے برصغیر کے تمام معاملات براہ راست خود سنبھال لیے۔ برصغیر پاک و ہند میں برطانوی راج 1947ء تک قائم رہا۔

اگر 1757ء سے لیکر 1947ء تک اس دور کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلی اور اہم بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ کمپنی اور برطانوی حکومت کے اَدوار میں تعلیمی نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں تھا بلکہ ایک تسلسل تھا۔ گو سیاسی حیثیت سے 1857ء ایک اہم موڑ ہے لیکن حکومتی پالیسی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ دوسری نمایاں بات یہ ہے کہ جو تعلیمی پالیسی کمپنی نے وضع کی تھی اس پر مکمل عمل برطانوی حکومت کے دور میں ہوا۔ اس لیے برصغیر کے لیے بنائی جانے والی انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کو سمجھنے کے لیے

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے فکری رجحانات کا بغور جائزہ لینا ضروری ہے۔

1- ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز

سیاسی حیثیت سے یہ دور کشمکش، تصادم اور کمپنی کے غلبہ کا دور ہے۔ 1757ء میں جنگ پلاسی میں کامیابی اور بنگال پر قبضہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج مسلسل پھیل رہا تھا اور یہ کمپنی پورے ملک پر قابض ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس لیے کمپنی نے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کی ذہنی تبدیلی کیلئے خصوصی طور پر تعلیم کے بارے میں دُوررس حکمت عملی تیار کرنے کو اولیت دی کیونکہ انہیں علم تھا کہ فوجی غلبہ تو ایک دن ختم ہو جائے گا لیکن ذہنی غلامی صدیوں تک قائم رہے گی جو صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن تھی۔

اگرچہ 1765ء سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیاں زیادہ تر تجارت تک محدود تھیں لیکن اس دوران میں بھی کمپنی نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بھرپور اور اہم اقدام کیے۔ اس مقصد کے لیے مقامی لوگوں کو بھرتی کیا گیا اور عیسائیت کی منظم تبلیغ کے لیے انہیں کمپنی کے خرچ پر عیسائیت کی تعلیم دلائی گئی۔ 1698ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید کرتے وقت برطانوی پارلیمنٹ نے باقاعدہ طور پر ایک شق منظور کی جس کی رو سے کمپنی کے لیے یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ ہندوستان میں قائم اپنی تمام فیکٹریوں اور تجارتی جہازوں پر عیسائی مبلغین کا تقرر کرے اور حسب ضرورت عیسائیت کی تبلیغ کے لیے سکول قائم کرے۔

برصغیر میں کمپنی کے اقتدار میں عیسائی مشنریوں کی تعلیمی سرگرمیوں سے مقامی لوگوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور مسلمانوں نے پوری قوت کے ساتھ مشنری اداروں کی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھائی جبکہ ہندوؤں نے بالعموم عیسائی مشنری تعلیمی اداروں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں کے احتجاج کا یہ اثر ہوا کہ کمپنی کو اپنی تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کرنا پڑی۔

اس دور میں ہندوستان میں کمپنی کی تعلیمی پالیسی کا بانی چارلس گرانٹ تھا۔ چارلس گرانٹ (Charles Grant) ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ بعد میں ایک عیسائی مشنری کے طور پر اس نے پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس نے ہندوستان کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کو پست اور لوگوں کو جہالت کا مرقع قرار دیا اور برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمے داری قبول کرنے کا مشورہ دیا تاکہ انہیں مغربی علوم کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تعلیم دی جاسکے۔ اس مقصد کے لیے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے ساتھ انگریزی زبان وادب کو نصاب میں شامل کرنے کا کہا گیا۔ 1813ء کے بعد سے لے کر 1947ء تک برطانوی تعلیمی پالیسی میں چارلز گرانٹ کے ان تصورات کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اسی لیے چارلز گرانٹ کو برصغیر کے موجودہ تعلیمی نظام کا بانی کہا جاتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس دور کی تعلیمی پالیسی سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:۔

i- مغربی علوم اور عیسائیت کے فروغ کے لیے مشنری اداروں کی بالواسطہ اور بلاواسطہ مدد اور سرپرستی کی جائے۔

ii مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کو بھی جاری رکھا جائے تاکہ کاروبار حکومت میں فوری خلل واقع نہ ہو۔

iii- مشرقی علوم میں ادب کو بنیادی اہمیت دی جائے، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کو قائم رہنے دیا جائے، اعلیٰ مذہبی اداروں کو مالی امداد دی جائے اور پنڈتوں اور مولویوں کو خطابات اور انعامات سے بھی نوازا جائے۔ بااثر ہندوستانیوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کے بچوں کو اعلیٰ ملازمتیں دی جائیں۔

iv- ایسے نئے اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جو کمپنی کی پیدا ہونے والی نئی ضروریات کو پورا کرسکیں اور ان میں ایسے افراد تیار کیے جائیں جو ان کے نئے نظام کو کامیاب بنانے اور کمپنی کے استحکام میں معاون ثابت ہوں۔

اس دور کے جائزہ سے بظاہر یہ احساس ہوتا ہے کہ کمپنی تعلیمی معاملات میں غیر جانبدار تھی جیسا کہ مغربی مورخین نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن درحقیقت یہ ایسی تعلیمی حکمت عملی تھی جس کے باعث مقامی تعلیمی نظام سسک سسک کر اپنی موت آپ مر گیا اور کمپنی کے نظام تعلیم نے فطری رفتار کے ساتھ مکمل غلبہ اور تسلط حاصل کر لیا۔

کمپنی کی اس تعلیمی حکمت عملی کو برطانیہ کے مذہب پرست طبقہ نے عیسائیت سے غداری کے مترادف قرار دیا جس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ نے 1813ء کا چارٹر ایکٹ پاس کیا۔ یہ قانون ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اس ایکٹ کی نمایاں دفعات یہ تھیں:۔

i- تعلیم کمپنی کی ذمہ داری ہوگی اور اسے اپنے وسائل میں سے ایک لاکھ روپے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے مخصوص کرے گی۔

ii- تعلیم کے لیے مختص شدہ رقم باقاعدہ مغربی علوم کی اشاعت اور مشرقی علوم کے احیا اور مقامی اہل علم کی حوصلہ افزائی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

iii- تعلیم کا اولین مقصد اہل ہند تک عیسائیت کا پیغام پہنچانا ہوگا جس کے لیے مشنری اداروں کی سرپرستی کی جائے گی۔

iv- مغربی علوم وسائنس کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے دی جائے گی۔

1813ء کا چارٹر ایکٹ ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم کے لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعد کے سالوں میں ہونے والا تمام تعلیمی ارتقا انھیں خطوط پر ہوا۔ اس ایکٹ کی رو سے مشنری تعلیم کو قانونی تحفظ فراہم کر دیا گیا اور یہ بات ہمیشہ کے لیے طے پا گئی کہ ہندوستان میں تعلیم کا مقصد مغربی علوم اور انگریزی زبان کے ذریعے اہل ہند کو عیسائیت کی طرف لے جانا ہے۔ اس مقصد کو آہستہ آہستہ اور خاموشی کے ساتھ مقامی نظام تعلیم کو ختم کر کے حاصل کیا جائے گا۔ یہ وہ فکری بنیاد تھی جس پر نئی برطانوی تعلیمی پالیسی استوار کی گئی اور جسے میکالے نے ترقی دے کر ایک نظام بنا دیا جس کا بنیادی مقصد ہندوستان میں اپنی حکومت کے لیے ملازمین کا حصول تھا۔

2- چارٹر ایکٹ (1813ء)

1813ء کے ایکٹ کے باعث مشنری تعلیمی اداروں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ 53-1852ء میں تمام سرکاری سکولوں اور کالجوں میں صرف 30 ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے جبکہ نئے قائم شدہ مشنری اداروں میں 3 لاکھ طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عیسائیت کو پورے نظام تعلیم میں سمو لیا گیا تھا اور ان میں ذریعہ تعلیم بھی انگریزی تھا جس کی نتیجے کے طور پر مقامی لوگوں کی بہت زیادہ تعداد نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔

لارڈ میکالے (Lord Macaulay) جو 1833ء میں سپریم کونسل کا ممبر اور پبلک انسٹرکشن کمیٹی کا سیکرٹری مقرر ہو کر ہندوستان آیا تھا، 2 فروری 1835ء کو گورنر جنرل کی کونسل کو پیش کی جانے والی اپنی یادداشت میں اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم اور علم و ادب کو ختم کر دیا جائے اور ہندوستانیوں کی جملہ معاشرتی و معاشی برائیوں کے خاتمے کے لیے مقامی علوم کی بجائے یورپی علوم کو ہندوستان میں پڑھایا جائے۔ اس نے انگریزی زبان کو ذریعہ تدریس بنانے کی وکالت کی۔

میکالے نے 1813ء کے ایکٹ کی رو سے مشرقی علوم کی ترقی کے لیے دی جانے والی مالی امداد بند کرنے کی سفارش کی اور واضح طور پر کہا کہ تعلیم کا مقصد ایسی نسل تیار کرنا ہے جو مغربی افکار و نظریات کی ترجمان ہو اور جو رنگ و نسل کے اعتبار سے بلاشبہ ہندی ہو لیکن فکر و نظر اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے خالص انگریزی ہو۔ میکالے کی ان سفارشات کی روشنی میں تیار ہونے والی تعلیمی پالیسی کو بینٹنگ ریزولیوشن (Benting Resolution) کہتے ہیں جسے 7 مارچ 1835ء میں منظور کیا گیا۔

اس ریزولیوشن کے اہم خدوخال یہ ہیں:۔

- i- سرکاری تعلیم کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم وسائنس کا فروغ ہے۔
- ii- آئندہ سے ملک کی سرکاری زبان فارسی کی بجائے انگریزی ہوگی۔
- iii- ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔
- iv- مشرقی علوم کی اشاعت پر آئندہ سے کوئی رقم خرچ نہیں کی جائے گی۔

تعلیم کا مقصد لوگوں کو سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کرنا، خاص طور پر نچلی سطح کے انتظامی عملہ کی فراہمی قرار پایا۔ میکالے کی یادداشت آئندہ برطانوی تعلیمی پالیسی کا رہنما اصول بن گئی جس کے نتیجے میں ہندوستان میں تعلیم کا نظام اپنی قومی اساس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔

1841ء میں تعلیم عامہ کمیٹی کو ختم کر کے اس کی بجائے 1842ء میں کونسل آف ایجوکیشن قائم کر دی گئی۔ 1844ء میں لارڈ ہرڈنگ (Lord Hurding) نے واضح طور سے اعلان کر دیا کہ سرکاری ملازمت کے لیے ان افراد کو ترجیح دی جائے گی جو سرکاری سکولوں کے تعلیم یافتہ ہوں گے۔ یوں سرکاری ملازمت کا حصول تعلیم کا مقصد بن گیا۔

اس دور میں انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کا ایک پہلو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز وتفریق کا آغاز تھا۔ ہر ممکن کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ہر میدان میں آگے بڑھایا جائے۔ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو ختم کرنے کے لیے ملازمتوں کے لیے اخبارات میں دیے جانے والے اعلانات میں بھی یہ لکھ دیا جاتا تھا کہ صرف ہندوؤں کو ملازم رکھا جائے گا۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ دور سر چارلس ووڈ (Sir Charles Wood) کے 1854ء کے ڈسپیچ (Despatch) (مراسلہ) پر اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس ڈسپیچ نے جدید تعلیم کے مقاصد کو قانونی شکل دی۔ اسے منظم کرنے کا طریقہ کار وضع کیا، انگریزی کو مستقل ذریعہ تعلیم کی حیثیت دے دی گئی اور ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے قیام کی منظوری دی۔

سیاسی اعتبار سے یہ دور مسلمانوں کے لیے مصائب وآلام کا دور تھا اور وہ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے۔ تعلیمی میدان میں یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے مایوسیوں کا زمانہ تھا۔ ان کا تعلیمی نظام ختم کر دیا گیا تھا۔ ان کے تمام مدارس غیر تسلیم شدہ قرار دے دیے گئے۔ عام اور مفت عوامی تعلیم کا دور ختم ہوگیا۔ تعلیم کو قابل فروخت چیز بنا دیا گیا۔ جہاں صرف صاحب ثروت لوگ ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔

1813ء سے 1854ء تک کے دور کے اہم تعلیمی واقعات کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

- i- 1815ء میں سرکاری سطح پر بمبئی ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی گئی۔
- ii- 1816ء میں 'کلکتہ ودیالیا' کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا۔ جس کو 1819ء میں کالج بنا دیا گیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا گورنمنٹ کالج تھا۔ یہاں کا ذریعہ تدریس انگریزی مقرر کیا گیا۔
- iii- 1823ء میں تعلیم عامہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور ہندی زبان کے فروغ کے لیے آگرہ میں تعلیمی ادارہ کھولا گیا۔
- iv- 1828ء میں گورنر جنرل ولیم بنٹنگ (William Bunting) نے مسلم مدارس کے اوقاف ضبط کرنے کا حکم دیا۔
- v- 1836ء میں نئی طرز پر ہگلی کالج کلکتہ اور میڈیکل کالج کلکتہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔
- vi- 1844ء میں ہندو کالج کلکتہ میں انجینئرنگ کی کلاسیں شروع کی گئیں۔
- vii- 1847ء میں انجینئرنگ کالج رڑکی قائم کیا گیا۔

3- ووڈ ڈسپیچ (1854ء)

اس دور کا نقطۂ آغاز ووڈ ڈسپیچ (وڈ کا مراسلہ) ہے۔ 1853ء سے قبل برطانوی پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی نے ہندوستان میں سرکاری تعلیمی پالیسی کا تفصیلی جائزہ لیا جسے چارلس ووڈ (Charles Wood) نے اپنے مشہور مراسلے کی شکل میں 1854ء میں کمپنی کو ارسال کیا۔

ووڈ ڈسپیچ میں سنسکرت اور عربی کی تعلیم کی واضح مخالفت نظر آتی ہے۔ اس کی اصل روح وہی میکالے کا نظریہ ہے جس میں مغربی علم و ادب کی بالادستی کا تصور پایا جاتا ہے۔ میکالے (Macaulay) کی طرح اس ڈسپیچ میں بھی مشرقی علم و ادب کو غلطیوں کا مرقع قرار دیا گیا تھا۔ مقامی زبانوں کو انگریزی کے ساتھ ساتھ ذریعہ تعلیم بنانے کی حمایت تو کی گئی تھی لیکن ان زبانوں کو جدید علم کے ''اخذ و ترجمہ اور تدریس'' کے معاملے میں نااہل قرار دے دیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر سے ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کر دی گئی تھی اور حکومت برطانیہ براہِ راست ہندوستان پر حکمرانی کر رہی تھی۔ برصغیر کے ہندوؤں نے خود کو برطانوی حکمرانوں کے ساتھ کلی طور پر ہم آہنگ کر لیا تھا۔ وہ مسلمانوں پر فوقیت حاصل کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ دوسری طرف برطانوی حکومت کی پوری کوشش تھی کہ مسلمانوں کو اتنا دبا دیا جائے کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ ووڈ ڈسپیچ کو عملی جامہ پہنانے کا زمانہ ہے۔ اس کے اہم خدوخال یہ ہیں:۔

i- ہر صوبے میں تعلیم کا محکمہ قائم کیا جائے گا جس کا سربراہ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ہوگا۔ اس کی مدد کے لیے مناسب تعداد میں انسپکٹر مقرر کیے جائیں گے جو گورنمنٹ کے خرچ پر یا امداد سے چلنے والے سکولوں اور کالجوں کا ہر سال معائنہ کیا کریں گے۔

ii- محکمہ تعلیم صوبے کی تعلیمی ترقی کے لیے ضروری اقدامات کے سلسلے میں، سالانہ رپورٹیں تیار اور تعلیمی اعداد و شمار شائع کرے گا۔

iii- لندن یونیورسٹی کی طرز پر ملک میں یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔ 1857ء میں بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ پنجاب یونیورسٹی 1882ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ شروع میں یونیورسٹیاں صرف امتحان لینے والے ادارے تھیں۔ بعد ازاں ان کو تدریسی درجہ دے دیا گیا۔

iv- گرانٹس ان ایڈ (Grants in Aid) کا نظام رائج کیا جائے گا تاکہ حکومت کے علاوہ دوسری ایجنسیاں بھی انگریزی تعلیم پھیلانے میں مدد دے سکیں۔ گرانٹ صرف انہیں اداروں کو ملے گی جن میں (الف) سیکولر تعلیم دی جائے گی۔ (ب) انگریزی ذریعہ تعلیم ہوگی۔ (ج) انسپکٹر کو معائنہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ (د) گرانٹ کی مقرر کردہ شرائط پوری کی جائیں گی۔

v- انگلستان میں قائم تربیت اساتذہ کے اداروں کی طرز پر برصغیر میں اساتذہ کی تربیت کے لیے ادارے قائم کیے جائیں گے اور زیرِ تربیت اساتذہ کو تعلیم کے لیے وظائف دیے جائیں گے۔

vi- قانون، طب اور انجینئرنگ کے شعبوں میں بھی تربیت کا اہتمام کیا جائے گا۔

vii- تعلیم نسواں کو یکساں اہمیت اور سرپرستی دی جائے گی۔

viii- سرکاری اداروں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جائے گی۔

یونیورسٹیوں کے قیام سے ہندوستان میں مغربی طرز کا تعلیمی نظام قائم ہوگیا۔ پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے درمیان ایک تدریجی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ پورا نظام مربوط ہوگیا لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ثانوی تعلیم طالب علموں کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرنے کی بجائے یونیورسٹیوں میں داخلہ کا ذریعہ بن کر رہ گئی اور اس طرح نظام تعلیم ملک کے

حالات اور ضروریات سے کٹ کر رہ گیا۔ گرانٹس ان ایڈ کے ذریعے پرائیویٹ سکول اور کالج بھی محکمہ تعلیم کے کنٹرول میں آ گئے اور اس طرح حکومت کی تعلیم پر گرفت بہت زیادہ بڑھ گئی۔

4- سارجنٹ رپورٹ (Sergeant Report)

حکومت برطانیہ نے 1944ء میں ہندوستانیوں کے لیے ایک نئی تعلیمی سکیم تیار کی جس کو سارجنٹ رپورٹ کہا جاتا ہے۔ اس سکیم کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

i- چودہ برس تک کی عمر کے تمام بچوں کے لیے تعلیم مفت اور لازمی ہوگی۔

ii- چھ برس تک کی عمر کے بچوں کے لیے سرکاری مدارس میں تربیت یافتہ اساتذہ کی زیرِ نگرانی نرسری کلاسیں کھولی جائیں گی۔

iii- سات سے گیارہ سال کی عمر کے بچوں کو دی جانے والی تعلیم کو پرائمری تعلیم کا نام دیا گیا۔

iv- بارہ سے سولہ سال کی عمر تک ہائی سکول کی تعلیم مہیا کی جائے گی۔

v- ٹیکنیکل اور تجارتی تعلیم کا انتظام کرنا بھی سکیم کا حصہ بنایا گیا۔

vi- تعلیم بالغاں اور سرکاری کتب خانوں کو بہتر بنانا بھی سکیم میں شامل کیا گیا۔

vii- اساتذہ کی تربیت کا معقول انتظام اور ملازمت کے قواعد کو بہتر بنانا۔

viii- طلبہ کی جسمانی تربیت، اُن کا طبی معائنہ اور ضرورت کے مطابق علاج۔

ix- ذہنی اور جسمانی طور پر معذور بچوں کے لیے بھی تعلیمی سہولیات مہیا کرنا۔

x- بچوں کے لیے سماجی اور تفریحی مشاغل کا انتظام کرنا بھی سارجنٹ سکیم میں شامل تھا۔

xi- رپورٹ میں بچوں کی زیادہ سے زیادہ عملی تعلیم پر زور دیا گیا تھا تاکہ بچے آئندہ زندگی میں مناسب پیشہ اختیار کر سکیں۔

بنیادی تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ میں سے صرف ذہین بچوں کو ہائی سکولوں میں داخلے کا حق دیا گیا تھا۔ اس طرح ہائی سکولوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد کل طلبہ کی تعداد کا صرف 20 فیصد رہ گئی۔ طلبہ سے ہائی سکول کی تعلیم کے لیے فیس لی جاتی تھی جبکہ 50 فیصد ذہین، مستحق اور غریب طلبہ کے لیے وظائف دینے کا اعلان کیا گیا۔

ہائی سکولوں کی دو قسمیں تھیں:

i- عمومی ہائی سکول   ii- ٹیکنیکل ہائی سکول

عمومی سکولوں میں آرٹ اور سائنس کی تعلیم دینا مقصود تھا جبکہ ٹیکنیکل سکولوں میں صنعتی، تجارتی اور پیشہ ورانہ مضامین اور مہارتوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان سکولوں میں سائنس کا مضمون لازمی تھا۔ اس کے علاوہ لکڑی، پتھر اور دھات کے کام کی تعلیم کا انتظام تھا۔

برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کی خصوصیات

برطانوی تسلط کے تحت برصغیر میں قائم شدہ نظام تعلیم اور اس کے ارتقاء کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں کا قائم کردہ یہ نظام بنیادی طور پر مقامی نظام تعلیم مسلمانوں کے اس نظام تعلیم کو ختم کرنے کی کوشش تھی جو مسلمان حکمرانوں کے دور سے ہندوستان میں رائج تھا۔ جس میں تعلیم عام اور مفت تھی، تعلیمی ادارے مالی طور پر آزاد، خودمختار اور علمی طور پر حکومتی اثرات سے آزاد تھے۔

برطانوی نظام تعلیم اپنی اساس اور طریق کے لحاظ سے مقامی نظام تعلیم خصوصاً مسلمانوں کے تعلیمی ورثہ کے خلاف تھا۔ کمپنی کے

اولین سالوں میں تبلیغ عیسائیت کے حوالے سے عیسائی مشنریوں کا تعلیم میں براہ راست عمل دخل بعد میں سیاسی حالات کی بنا پر بالواسطہ انداز میں جاری رہا۔ سکولوں کے نصاب میں بظاہر عیسائیت کی تعلیم وتبلیغ تو شامل نہ تھی لیکن عملی طور پر تعلیمی پالیسیوں میں مغربی علوم وفنون، تہذیب وثقافت اور کلچر کی ترویج کو ہی مرکزی اور نمایاں مقام حاصل رہا، اگرچہ بعض ادوار میں ایسی کئی حکومتی پالیسیاں بھی وضع کی گئیں جن میں مقامی نظام تعلیم اور زبانوں کے بارے میں مثبت رویے اختیار کیے گئے لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی مکمل طور پر عمل نہیں ہوسکا۔ یہی سبب ہے کہ قیام پاکستان کے مرحلے تک پہنچتے پہنچتے برصغیر کا نظام تعلیم اپنے اصل سے بالکل کٹ گیا۔ لہٰذا 1947ء میں جو نظام تعلیم پاکستان کو ورثے میں ملا وہ کسی طرح سے بھی ایک نظریاتی مملکت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اسلام کے تعلیمی نظام سے مطابقت رکھتا تھا۔ اگلی سطور میں برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کی خصوصیات کا عمومی جائزہ پیش ہے۔

1- مقاصد تعلیم

برصغیر پر برطانوی حکمرانی ایک استعماری قوت کا قبضہ تھا۔ اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے ہر وہ طریقہ استعمال کیا جس کے ذریعے وہ مقامی لوگوں پر زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے غالب رہ سکیں۔ تاجر کی حیثیت سے آنے والی یہ قوم فاتح بن کر ہندوستان کی قسمت کی مالک بن گئی۔ برطانوی حکومت نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے محکوم ہندوستانیوں کو ایسے نظام تعلیم سے روشناس کروایا جس نے ان کو غلامی میں ایسا پختہ کار بنادیا کہ آزادی حاصل کرلینے کے بعد بھی برصغیر کے لوگ انگریز کی ذہنی غلامی سے چھٹکارہ نہیں پاسکے۔ یہ سب اس نظام تعلیم ہی کے باعث ممکن ہوا جو انگریزوں نے برصغیر کے لوگوں کے لیے خاص طور پر شروع کیا۔ برصغیر کا یہ نظام تعلیم برطانیہ میں رائج نظام تعلیم سے بالکل مختلف تھا۔ ظاہر ہے انگلستان میں جاری نظام تعلیم کا مقصد ایک آزاد قوم کی تشکیل جبکہ برصغیر میں قائم نظام تعلیم کا مقصد محکوم قوم پیدا کرنا تھا۔ کیونکہ انگریزوں کو ہندوستان میں حکومتی کام چلانے کے لیے نچلے درجے کے اہلکاروں کی ضرورت تھی جبکہ افسران برطانیہ ہی سے آتے تھے۔ اس نظام تعلیم کا اولین مقصد حکومت برطانیہ کے لیے وفادار ملازمین کی فراہمی تھا لیکن اس کا دوسرا اہم مقصد ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ جس کے لیے خاص طور پر نچلی ذات کے ہندوؤں کو ہدف بنایا گیا۔

2- نصاب تعلیم

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ انگریز برصغیر کے مقامی تعلیمی نظام کو غیر موثر بناتے۔ لہٰذا انہوں نے ملازمتوں کو حکومت کے منظور کردہ ان تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل افراد کے لیے مخصوص کردیا جن کا نصاب حکومت کی طرف سے متعین تھا جس میں انگریزی زبان وادب اور مغربی علوم وفنون شامل تھے۔ ان میں زیادہ تر مشنری ادارے تھے جو عام طور پر گرجا سے متصل ہوتے تھے۔ ان میں صلیب نمایاں مقام پر نصب ہوتی تھی۔ اساتذہ پادری تھے جو مخصوص لباس پہنتے تھے۔ غرض تعلیمی اداروں کا پورا ماحول مسیحی ہوتا تھا جہاں عیسائیت کی تعلیم لازمی تھی۔ تعلیم میں سیکولر پالیسی سے مراد یہ تھی کہ عیسائیت کے سوا کسی بھی دوسرے مذہب کو نظام تعلیم میں کوئی دخل نہیں تھا۔

i- انگریزی

برطانوی نظام تعلیم کے تحت ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں انگریزی زبان وادب کی تدریس کو سب سے زیادہ

اہمیت دی جاتی تھی۔ انگریزی کو تیسری جماعت سے بی۔ اے تک لازمی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ سب سے زیادہ وقت انگریزی کی تدریس کے لیے مختص تھا، انگریزی کے استاد کو سب سے زیادہ پروقار مقام حاصل تھا، ملازمتیں بھی صرف انگریزی جاننے والوں کو ہی ملتی تھیں۔ یوں بچوں کی پوری تعلیمی زندگی میں انگریزی ذہنوں پر مسلط رہتی تھی۔

ii- تاریخ

ان تعلیمی اداروں کے نصاب میں برصغیر کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے دور کی اچھی باتوں کو بھی غلط انداز میں لکھا گیا۔ تاریخی واقعات کی تشریح انگریزوں کے نقطۂ نظر سے کی گئی۔ یورپ اور خصوصاً انگلستان کی تاریخ کو اس طرح پڑھایا جاتا تھا کہ طلبہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر انگریزوں کو برتر مان لیں اور ہندوستان میں ان کی آمد ایک مہذب قوم کے طور پر تصور کی جائے۔ خاص طور سے ہندوؤں کو مسلمانوں سے متنفر کرنے کے لیے تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔

iii- معاشیات

معاشیات جیسے بامقصد اور عملی مضمون کے نصاب کو یوں مرتب کیا گیا کہ انسان کی زندگی کا مقصد صرف پیسہ رہ گیا تھا اور اس کی زندگی ایک معاشی حیوان سے زیادہ کچھ نہ رہی۔ مغربی معاشی تصورات کے مطابق انسان انتہائی خودغرض ہے جو ہر وقت مادی فائدے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ سود، ذخیرہ اندوزی سب پیسہ کمانے کے طریقے ہیں جن میں کوئی اخلاقی قباحت نہیں۔ معاشیات کا یہ نصاب بنیادی طور پر اسلامی تصور حیات کے خلاف تھا۔

vi- سیاسیات

سیاسیات کے مضمون کا نصاب بھی اسلامی تصورات سے متصادم تھا۔ جمہوریت کے مغربی تصور میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اسلامی نظریے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ عوام کی حاکمیت کا تصور مسلمانوں کے نزدیک سراسر بے دین تصور تھا۔ اس لیے نصاب کا یہ حصہ بھی مغربی فکر کو فروغ دینے کا باعث تھا۔

v- سائنس

تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی سائنس کے نصاب سے طلبہ میں نئی چیزوں کی تلاش کی صلاحیت پیدا نہ ہوتی تھی بلکہ الٹا وہ کائنات کی تخلیق و انتظام کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور مذہب کو نصاب سے بالکل خارج کر دیا گیا اور اردو کو بھی صرف پرائمری مدارج کے نصاب تک محدود کر دیا گیا۔ اس طرح اہل ہند کو ان کے تمدن سے کاٹ دیا گیا۔

3- نظام امتحان

انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے سے قبل برصغیر میں مسلمانوں کا نظام تعلیم رائج تھا۔ اس نظام کا بنیادی مقصد تعمیر کردار، اچھے انسان پیدا کرنا تھا۔ استاد جو اس نظام کا مرکزی کردار تھا، نہایت اعلیٰ مقام رکھتا تھا اور وہ ایک رول ماڈل کی حیثیت سے علم و کردار کا اعلیٰ نمونہ طلبہ کے سامنے پیش کرتا تھا اور طلبہ کی علمی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کے کردار کی تربیت بھی کرتا تھا لیکن انگریزوں نے استاد کو بھی ایک عام سرکاری ملازم بنا کر رکھ دیا۔ اسے اس اعتماد کا اہل بھی نہ سمجھا گیا کہ اس کی رائے سے طالب علم کے اکتساب کا معیار مقرر کیا جاتا۔

اس کی بجائے انھوں نے تحریری امتحانات کا ایک ایسا نظام رائج کیا جس میں آج بھی استاد کو کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس کو علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس طالب علم کے رویوں اور کردار کے بارے میں جائزہ پیش کر رہا ہے۔ طالب علم کو تربیت اور کردار سے غرض نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق صرف نمبر حاصل کرنے تک محدود ہو گیا۔ پاس ہونے والوں کی درجہ بندی کے لیے درجہ اول، درجہ دوم یا سوم کا تعین کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ ان امتحانوں میں بدعنوانیوں کا عمل دخل بڑھتا گیا لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ نصاب امتحان کے تابع ہو گیا جبکہ نصاب اور تدریس کا اصل مقصد صرف معلومات و تصورات کو یاد کرنا نہیں بلکہ ان کا اطلاق اور رویوں کی تشکیل تھا جس کی جانچ کا انگریزوں کے نظام امتحان میں کوئی انتظام ہی نہ تھا۔ اقدار کے تحفظ اور رویوں کی تشکیل کو چونکہ امتحان کے نظام میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی اس لیے عملی تدریس کے اعتبار سے یہ نظام باکردار، باعمل اور تربیت یافتہ افراد پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات

قیام پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی مسلسل جدوجہد اور بے شمار لازوال قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ 1757ء میں جنگ پلاسی سے لے کر 1947ء میں قیام پاکستان تک کا دور غلامی و مشکلات کا دور تھا لیکن ساتھ ہی یہ جہد مسلسل کا دور بھی تھا جس میں وطن کی آزادی کے لیے سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور تعلیمی تحریکوں نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ہر سیاسی کوشش کے پیچھے کسی نہ کسی مذہبی، نظریاتی یا تعلیمی تحریک کا اہم کردار رہا ہے۔

1757ء میں بنگال پر انگریزوں کے حملے کے بعد سے مسلمانان برصغیر اپنی آزادی کے لیے مسلسل کوششیں کرتے رہے۔ جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ، میسور کی جنگوں میں فتح علی خان ٹیپو اور پھر احمد شاہ ابدالیؒ کی کوشش اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد اور پھر 1857ء کی جنگ آزادی انہیں کوششوں کا حصہ ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے اسی دور غلامی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اور تعلیمی تحریک نے بھی مسلمانوں میں اخلاقی، دینی اور سیاسی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب اور سچ ہوگا کہ ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمی تحریک کے بعد کی تمام تعلیمی تحریکیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی تحریک کا تسلسل تھیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے دور میں اگرچہ انگریز براہ راست ہندوستان کے حکمران نہیں تھے لیکن مسلمان بطور قوم زوال کا شکار تھے۔ ان میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ حکمران باہمی اختلافات کا شکار تھے لیکن اس کے باوجود ایک مربوط اور موثر نظام تعلیم کام کر رہا تھا۔ 1857ء میں ہندوستان پر غلبہ پانے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے منسوخ کر دیا۔ ہر وہ قدم اٹھایا اور ہر وہ فیصلہ کیا جس سے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو ناکام بنایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے تعلیمی اداروں سے منسلک اوقاف پر قبضے کر لیے۔ عربی اور فارسی زبان پر پابندی لگا دی۔ ملازمتیں صرف سرکاری اور مغربی تعلیم حاصل کرنے والے لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں۔ اس ساری صورت حال سے سب سے زیادہ فائدہ ہندوؤں نے اٹھایا۔ انہوں نے مغربی تعلیم حاصل کی۔ سرکاری پالیسیوں کو اپنایا۔ انگریزوں کا مسلسل ساتھ دیا جس کے باعث ہندوستان کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں انھیں انگریزوں کی سرپرستی حاصل رہی اور مختلف ملازمتیں حاصل کرنے کے بعد وہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ اچھی حیثیت اور مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ ساری صورت حال مسلمانوں کے لیے پریشان کن تھی۔ ان کے ایک طبقے کی رائے تھی کہ مسلمانوں کو موجودہ حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے مغربی تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور انگریزوں کے نظام تعلیم سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل میں سیاسی آزادی

کے لیے کوشش کرنا چاہیے کیونکہ وقت کے ساتھ نہ چلنے کے باعث آنے والے وقت میں کامیابی مشکوک ہوجانے کے امکانات تھے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس کے لیے مغربی افکار اور انگریزی تعلیم ناقابل قبول تھی اور وہ اب بھی مسلمانوں کے تعلیمی ورثے کو اہم تصور کرتا تھا اور اسی میں مسلمانوں کی بہتری اور ترقی سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کے پہلے طبقے کی نمائندہ تحریک علی گڑھ اور دوسرے گروہ کی نمائندہ تحریک دیوبند تھی۔ اگرچہ دونوں تحریکیں دو مختلف نقطہ نظر رکھتی تھیں اور بعض معاملات پر متفق بھی نہ تھیں لیکن دونوں خلوص دل سے برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور عروج کو اپنا نصب العین سمجھتی تھیں۔

ان دونوں علمی تحریکوں نے برصغیر کی سیاسی زندگی پر اہم اثرات مرتب کیے جو قیام پاکستان کے بعد بھی کسی نہ کسی انداز میں جاری ہیں۔ خصوصاً نظام تعلیم کی تشکیل نو میں ان کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ان تحریکوں کا مفصل جائزہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

تحریک دیوبند

پس منظر

ہندوستان میں برطانوی قبضے کے بعد جب انگریزوں نے نئے نظام تعلیم کا نفاذ کیا تو ہندوؤں نے بہت جلد اس کو قبول کر لیا کیونکہ اس سے انھیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا پہلے ان کا مفاد عربی اور فارسی کی تعلیم سے منسلک تھا اب اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے انگریزی تعلیم کو اپنانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کا معاملہ ان سے بہت مختلف تھا وہ نئی صلورت حال کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے اس طرح ان کی تہذیبی اقدار اور علمی روایات ختم ہوجائیں گی۔ ان کو خطرہ تھا کہ نیا تعلیمی نظام مسلمانوں کو الحاد اور مغرب پرستی کی طرف لے جائے گا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اس صورت حال میں دینی علوم کا تحفظ اشد ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت صحیح اسلامی خطوط پر کی جاسکے اور ان کو مغربی افکار اور بے دینی کی یلغار سے مقابلہ کے لیے تیار کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے کوئی لائحہ عمل بنانے کے لیے مسلمان علماء اور اکابرین سہارن پور (یو۔پی) کے قصبہ دیوبند کی مسجد چھتہ میں مشاورت کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ جہاں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے ساتھی علما مقیم تھے۔ آخر 20 مئی 1866ء کو مولانا نانوتویؒ نے سہارن پور کے قصبے دیوبند میں ایک مدرسے کا آغاز کیا۔ مولانا نانوتویؒ مولوی مملوک کے شاگرد تھے جو شاہ ولی اللہؒ کے تعلیمی مکتب فکر کے پروردہ تھے اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین میں شامل رہے تھے۔ اس طرح تحریک دیوبند شاہ ولی اللہؒ کے نظریات ہی کا ایک تسلسل تھی۔ دارالعلوم کے پہلے سربراہ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور اولین شاگرد مولانا محمود الحسنؒ تھے۔

پہلے 9 سال تک مدرسہ بالکل ابتدائی حالت میں رہا۔ 1876ء میں نئی تعمیرات کے بعد آہستہ آہستہ ایک بڑے دارالعلوم اور علمی مرکز میں تبدیل ہوا۔ دارالعلوم حکومت سے مکمل لاتعلقی کے بنیادی اصول پر قائم ہوا تھا۔ بانی دیوبند نے اس کی بے سروسامانی کو توکل اور رجوع اللہ کا سبب قرار دیا۔ مستقل ذرائع آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ جس سے دارالعلوم کا تعارف دور دور تک پھیلا اور اس کے ہمدردوں اور شاگردوں میں بیرون ملک تک اضافہ ہوگیا۔

تحریک دیوبند کے اسباب

مندرجہ ذیل اسباب تحریک دیوبند کے شروع کرنے کا محرک تھے:۔

i- اسلام کا احیا

برصغیر میں مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح، بدعات کے خاتمے اور اصلاح اخلاق کے لیے مختلف تحریکیں برپا

ہوئیں۔ ان تمام کا بنیادی مقصد دین کا احیا، اسلام اور اسلامی علوم کی اشاعت وتحفظ کا جذبہ تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنا الگ نصاب تعلیم بھی مرتب کیا جو وقت کے تقاضوں کے مطابق تھا۔ دیو بند بھی ایسی ہی ایک تحریک تھی۔

ii- تبلیغ اسلام

عیسائی پادری اور مشنری ادارے 1857ء کے بعد مسلمانوں کے نظام تعلیم کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری سرپرستی میں کھلم کھلا عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کر رہے تھے۔ اس صورت حال میں ایسے مسلمان علما تیار کرنا بہت ضروری تھا جو تبلیغ اسلام اور عیسائیت کی تردید کا فریضہ انجام دے سکیں۔ تحریک دیو بند نے ایسے علما کی تیاری کا فریضہ بطریق احسن انجام دیا۔

تحریک دیو بند کی خصوصیات

یہ عظیم علمی تحریک مندرجہ ذیل خصوصیات کی وجہ سے ایک امتیازی شان کی حامل ہے:۔

i- برصغیر کی مختلف تعلیمی روایات میں توازن

برصغیر کے اہم اسلامی تعلیمی ادارے مختلف اسلامی علوم کی تدریس میں تخصیص رکھتے تھے۔ یہ ادارے معقولات، منقولات اور علم الکلام کے حوالے سے الگ الگ رجحان اور خصوصی تشخص کے حامل تھے۔ دارالعلوم دیو بند میں علم کے ان تینوں پہلوؤں میں توازن قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی جس سے دیو بند برصغیر کے مسلمانوں کی مجموعی سوچ اور اسلامی تعلیمی روایت کا نمائندہ ادارہ بن گیا۔

ii- دینی تعلیم کا تحفظ

دیو بند کے قیام کا بنیادی مقصد دینی علوم اور اسلامی تعلیمات کا تحفظ تھا۔ دارالعلوم دیو بند نے یہ خدمت بطریق احسن انجام دی اور بہت جلد یہ ادارہ دنیائے اسلام میں دینی علوم کی ترویج واشاعت کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے ہزاروں علماء اور طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے جنہوں نے اسلامی علوم کی ترویج اور اشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا اور لادینیت کی یلغار کے آگے بند باندھا اور بدعات کا خاتمہ کیا۔

iii- عملی فنون کی تعلیم

دارالعلوم دیو بند میں صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں دی جاتی تھی بلکہ لوگوں کو روزگار کے قابل بنانے کے لیے دیو بند میں مختلف فنون کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ جس میں طب کی تعلیم خاص طور پر اہم ہے۔ اس کے علاوہ خطاطی، جلد سازی اور کپڑا بننے کی مہارتیں سکھانے پر بھی توجہ دی گئی۔ جس سے دارالعلوم کے پروگرام کی ہمہ گیری اور معاشی ضروریات سے ہم آہنگی کا رجحان سامنے آتا ہے۔

iv- مالی وانتظامی پہلو

دارالعلوم دیو بند بنیادی طور پر ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے قائم ہوا تھا تاکہ حکومت مالی امداد کو دباؤ کے حربے کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔ اس لیے دیو بند نے اپنی داخلی آزادی کی خاطر حکومت سے مکمل لاتعلقی اختیار کی اور فیصلہ کیا کہ حکومت سے مالی مدد نہیں لی جائے گی۔ چندے کے لیے عام لوگوں سے رجوع کرنے سے دارالعلوم کا تعارف وسیع ہوا۔ دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ کی سادہ زندگی گزارنے کے انداز نے انہیں عوام سے قریب تر کر دیا اور یوں باہمی رابطوں اور تعلقات میں اضافہ ہوا اور تربیت عامہ کے مواقع پیدا ہوئے۔ دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں اسلام کے جمہوری اصول مشاورت کو اختیار کیا گیا۔ جس کے مطابق دارالعلوم کا مہتمم شوریٰ کے فیصلوں کے مطابق انتظام وانصرام کے فرائض انجام دیتا تھا۔

v- جذبۂ حریت

اکابرین دیوبند کے سرفروشانہ جذبے کی وجہ سے آزادی وحریت کا رجحان تحریک دیوبند کے مزاج میں ہمیشہ سے شامل رہا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں دیوبند کے علماء نے اہم کردار ادا کیا جن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام نمایاں ہیں۔

vi- تعمیر کردار

علما اور اکابرین دیوبند نے اصلاح اخلاق اور تعمیر کردار کے میدان میں بھی بہت کام کیا چنانچہ علم وفضل اور درس وتدریس کے ساتھ ساتھ دیوبند میں تقویٰ کی ایک فضا ہمیشہ قائم رہی جس سے مثالی کردار کے لوگ سامنے آئے۔

vii- دیگر تعلیمی ادارے

دارالعلوم دیوبند کی اسلامی تعلیمات کے تحفظ اور فروغ میں کامیابی کے باعث ایسے ہی بہت سے اور ادارے قائم ہوئے جن میں مظاہر العلوم سہارن پور، مدرسہ فیض عام کانپور، مدرسہ اشرفیہ مراد آباد جیسے مدارس شامل ہیں۔ آج بھی دینی تعلیم کے بیشتر مدارس دیوبند کی تحریک سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہیں۔ اس طرح دینی مدارس کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہوا جس سے مسلمانوں کے قومی نظام تعلیم کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔

viii- تصنیفی خدمات

درس وتدریس اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ وتعلیم کے ساتھ ساتھ علمائے دیوبند نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں تحقیق اور تصنیفی خدمات سرانجام دیں جو ان علماء کا بے مثال کارنامہ ہیں۔ تفسیر وحدیث، فقہ، تصوف، عربی زبان وادب اور تاریخ وسیرت کے متعلق علمائے دیوبند نے ایسا اور لازوال تحقیقی کام کیا۔ مصنفین میں مولانا محمود الحسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاسؒ کے نام نمایاں ہیں۔

تحریک دیوبند پر تبصرہ

تحریک دیوبند بنیادی طور پر مذہبی تحریک تھی۔ اس لیے دین کے حوالے سے مذہبی علوم اور اسلامی اقدار کے تحفظ میں اس کو کامیابی ملی۔ برصغیر پاک وہند کے بے شمار علما نے اس ادارے سے فیض حاصل کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دیوبند کے نصاب میں اس وقت کے تمام اسلامی مکتبہ ہائے فکر اور معروف تعلیمی اداروں کے نصابات کی بنیادی باتوں، روایات واقدار اور خصوصیات کو سمونے کی کوشش کی گئی جو اگرچہ ایک حد تک کامیاب رہی لیکن اس سے دیوبند کا نصاب غیر ضروری طور پر بوجھل ہوگیا۔

تحریک دیوبند نے مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہندوانہ رسوم ورواجات اور مختلف بدعات کو ختم کرنے میں تو نمایاں کردار ادا کیا لیکن یہ وقت کی ضروریات اور بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے پائی۔ عصری علوم جن میں خصوصاً انگریزی اور سائنس کے علوم شامل تھے، تحریک کا حصہ نہ بنائے گئے جس کے باعث اُسی کا نصاب عملی زندگی کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ فارسی جو دیوبند کے نصاب میں بلند مقام رکھتی تھی اب سرکاری ملازمتوں کی راہ میں رکاوٹ تھی کیونکہ اب وہ سرکاری زبان نہ رہی تھی اور ملازمتوں کے لیے مغربی اور سائنسی علوم پڑھنے والے لوگ درکار تھے۔

دیوبند میں علمی آزادی، فلسفہ اور منطق جیسے مضامین پر بہت زیادہ زور دیا گیا جس کے باعث بحث ومباحثہ کی فضا پیدا ہوئی جو بعد ازاں مناظروں کی صورت اختیار کر گئی اور اختلافات کا باعث بنی۔ ایک طرف تو دیوبند جیسے مدارس میں جدید تعلیم کی حوصلہ افزائی نہ کی گئی تو دوسری طرف جدید تعلیم کے اداروں نے دینی تعلیم سے قطع تعلق کیے رکھا۔ اس طرح دینی اور دنیاوی تعلیم دو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بٹ گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فاصلہ بڑھتا گیا جس کے باعث اسلامی تعلیمات کی جامعیت کا تصور مجروح ہوا لیکن بدقسمتی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا یہ تصور آج تک ہمارے معاشرے کا حصہ ہے اور سرکاری تعلیمی اداروں اور دینی مدارس کی صورت میں نظر آتا ہے۔

تحریک دیوبند جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا اسلامی ورثے کے تحفظ اور مسلمانوں کے الگ قومی تشخص کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی لیکن مسلمانوں پر مغرب اور مغربی علوم کی یلغار کو موثر طور پر روکنے میں ناکام رہی۔ جدید تعلیم اور سائنسی علوم کی بلا جواز مخالفت کے باعث تحریک دیوبند کو بہت سے مسلمانوں کی مخالفت کا سامنا بھی رہا جو دونوں علوم میں تعاون اور اعتدال کی فضا چاہتے تھے۔ وہ مسلمان رہتے ہوئے اور اسلامی ورثہ کو ساتھ لے کر چلتے ہوئے جدید علوم بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں علم کے بارے میں اسلام کی جامعیت سے یہی تصور سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ کو لوگوں میں قبول عام کا درجہ حاصل ہوا کیونکہ وہ دین و دنیا میں دُوری کے تصور کے قائل نہ تھے۔

تحریک علی گڑھ

پس منظر

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریز سارے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے برطانوی حکومت نے براہِ راست ہندوستان کا کنٹرول سنبھال لیا۔ مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کی سات سو سالہ حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔ مسلمانوں کے لئے یہ دور بہت کٹھن تھا۔ انگریزوں نے چونکہ مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اور ان کے خیال میں 1857ء کی جنگ آزادی کے سب سے زیادہ ذمہ دار مسلمان تھے اس لیے سب سے زیادہ مظالم اور مشکلات کا سامنا بھی مسلمانوں کو ہی کرنا پڑا۔ فارسی کا بطور سرکاری زبان خاتمہ کر دیا گیا۔ ان کے سکول اور مدارس بند اور اوقاف ضبط کر لیے گئے یہاں تک کہ ذاتی جائیدادیں بھی چھین لی گئیں۔ ان سے توہین آمیز سلوک کیا گیا اور کئی مسلمانوں کو کالے پانی (جزائر انڈمان) بھیج دیا گیا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا نظام تعلیم جاری کیا۔ ہندو جو پہلے مسلمان حکمرانوں کی رعایا کے طور پر زندگی گذار رہے تھے، اب انگریزوں کی غلامی کو قبول کر چکے تھے۔ ان کے لیے حکمرانوں کی تبدیلی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے اپنی وفاداریاں انگریزوں سے جوڑ لی تھیں جب کہ مسلمان ذہنی طور پر اس غلامی کے لیے تیار نہ تھے۔ یہی وہ بڑا سبب تھا کہ مسلمان تعلیمی لحاظ سے انتہائی پسماندہ تھے۔ ان کے تعلیمی نظام کو مفلوج کر دیا گیا تھا۔ انگریزی نظام تعلیم ان کی روایات کے منافی تھا۔ 1862ء میں انگریزی سکولوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد دس فیصد تھی۔ گورنمنٹ کالج ہگلی میں چار سو طلبہ میں سے صرف چار مسلمان تھے۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں جو 1856ء میں قائم ہوئیں تھیں، 1875ء تک ان کے 846 گریجویٹوں میں صرف سترہ مسلمان تھے۔ سرسید احمد خان نے 1877ء میں گذشتہ بیس سال کے اعداد و شمار اکٹھے کیے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی گریجوایٹ اور اعلیٰ ڈگریوں کے مالک 3155 ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد صرف 57 تھی۔ 1852ء تک کلکتہ ہائی کورٹ نے

240 ہندوستانیوں کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت دی جن میں سے صرف ایک مسلمان تھا۔ تعلیمی لحاظ سے سندھ بہت زیادہ پس ماندہ تھا، 1900ء تک سارے صوبے میں صرف تین سرکاری ہائی سکول تھے۔ قیام پاکستان تک وہاں کوئی سرکاری کالج نہ تھا البتہ حیدرآباد اور میرپور خاص میں ہندوؤں کے کالج موجود تھے۔ الغرض جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت انتہائی خراب ہوگئی۔ ہندو پڑھ کر ترقی کر چکے تھے جب کہ مسلمان مالی طور پر محتاج اور تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ ہو گئے۔

وہ اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں میں تعلیم کیلئے بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ملازمتیں چونکہ سرکاری تعلیم حاصل کرنے والے لوگوں کے لیے تھیں۔ اس لیے ہندوؤں نے انگریزی نظام تعلیم کو اپنالیا اور ملازمتوں پر قابض ہو گئے۔ اس ساری صورت حال میں مسلمان تعلیمی، معاشی اور معاشرتی طور پر ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ دُور بین اور حساس سوچ رکھنے والے مسلمان اس ساری صورت حال سے خوش نہ تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن سے سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے تحریک شروع کی تاکہ مسلمانوں کے جمود کو توڑا جاسکے اور تعلیم کے ذریعے وہ دوبارہ سے ایک باوقار اور منظم قوم کا مقام حاصل کرسکیں، اگرچہ سرسید نے مرادآباد اور غازی پور میں بھی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کیے تھے لیکن علی گڑھ میں قائم ہونے والا مدرسہ ترقی کرتے ہوئے ایک تحریک کی شکل اختیار کرگیا۔ اس لیے سرسید کی اس تعلیمی تحریک کا نام ہی تحریک علی گڑھ پڑ گیا۔

تحریک علی گڑھ کے مقاصد

تحریک علی گڑھ کے مقاصد درجہ ذیل ہیں:۔

i- مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیوں اور اختلافی صورت حال کو ختم کر کے باہمی اعتماد اور خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینا۔

ii- دینی اور دنیاوی تعلیم میں تفریق ختم کرنا اور قومی اور دینی تقاضوں سے ہم آہنگ جدید طرز معاشرت کو اپنانا۔

iii- مسلمانوں کو تعلیم خصوصاً جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا اور سرکاری ملازمتوں کے حصول کے قابل بنانا۔

iv- مسلمانوں کی تعلیمی حالت میں بہتری لاکر ان کو معاشی اور معاشرتی طور پر مستحکم کرنا۔

v- مسلمانوں میں توہم پرستی ختم کر کے سائنسی انداز فکر پیدا کرنا اور جدید علوم سے استفادے کے قابل بنانا۔

vi- مسلمانوں میں عظمت رفتہ کا احساس اُجاگر کرنا اور بحیثیت مسلمان قومی اور ملی تشخص کے احساسات پیدا کرنا۔

vii- اسلام کے تصور کو فروغ دینا، روایتی اور جدید تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور اس کا زندگی کے عملی مسائل سے ربط پیدا کرنا۔

viii- مسلمانوں کو کاروبار، ملازمتوں اور تعلیم کے لیے رہنمائی فراہم کرنا۔

سرسید احمد خاں کی تعلیمی خدمات

i- سائنٹیفک سوسائٹی

مسلمانوں کو جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لیے سرسید احمد خان نے غازی پور ہی میں 1864ء میں ایک اور ادارے کی بنیاد رکھی جس کا نام سائنٹیفک سوسائٹی رکھا گیا۔ اس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مستند انگریزی کتب کا اُردو ترجمہ شائع کیا جائے تاکہ جن لوگوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ یورپ کی علمی ترقی سے واقف ہوسکیں۔ دوسرے یہ کہ سوسائٹی ایسا مرکز بن جائے جہاں انگریز اور مقامی لوگ جمع ہو کر مشترکہ مفادات کے بارے میں تبادلہ خیالات کریں۔

اس سوسائٹی نے چند برس کے عرصہ میں بہت سی انگریزی کتابوں کا ترجمہ شائع کیا جس میں تاریخ، اقتصادیات، زراعت اور کیمیا کی کتب شامل تھیں۔ ترجمے اس قدر سلیس اور بامحاورہ تھے کہ پڑھنے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کتاب کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ سرسید کے تبادلے کے ساتھ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی جہاں انہوں نے اس کے لیے مستقل عمارت تعمیر کرائی۔ اس کے اجلاس مہینے میں دوبار ہوتے تھے جن میں ذی علم لوگ مختلف موضوعات پر بحث کرتے اور مقالے پڑھتے تھے۔

ii- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام 13 مارچ 1866ء سے ایک ہفت روزہ اخبار نکلنا شروع ہوا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کہلایا۔ یہ اخبار کچھ عرصہ بعد سہ روزہ ہوگیا۔ اس کے دو بڑے مقاصد میں انگریزوں کو ہندوستانی باشندوں کے احساسات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو برطانوی نظام حکومت سے روشناس کرانا شامل تھا۔

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک صفحہ انگریزی اور دوسرا اُردو میں ہوتا تھا جن سے انگریزی اور اردو سمجھنے والے دونوں طبقے مستفید ہوتے تھے۔ اس میں معاشرتی، اخلاقی، سیاسی اور علمی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ ابتداء میں زیادہ تر سرسید کے وہ مضامین شامل تھے جو وہ سوسائٹی میں بطور لیکچر پیش کرتے تھے۔ یہ اخبار ہمیشہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ ہر خبر مستند ذرائع سے دی جاتی تھی۔ اس نے مقامی صحافت میں بڑا مقام پیدا کیا اور شائستگی کو ہمیشہ اپنا شعار رکھا۔

iii- علی گڑھ کالج

سرسید احمد خان نے انگلستان کے مختصر قیام کے دوران وہاں کے نظام تعلیم کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کو یہ بات خاص طور پر پسند آئی کہ وہاں طالب علموں کو نہ صرف علم سکھایا جاتا ہے بلکہ مہذب زندگی بسر کرنے کے اصول ذہن نشین کرا کر ان کی کردار سازی بھی کی جاتی ہے۔ پس سرسید نے فیصلہ کیا کہ اسی طرز پر برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک اقامتی درس گاہ قائم کی جائے۔

سرسید احمد خان نے ایک جدید اسلامی درسگاہ کا خاکہ پیش کیا۔ اس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم اے او کالج) تجویز کیا گیا۔ یہ ادارہ 24 مئی 1875ء کو علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او ہائی سکول کی صورت میں قائم ہوا اور دو برس بعد ہی 1877ء میں ایم اے او کالج کے طور پر کام کرنے لگا۔

علی گڑھ کالج بہت سی خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کی عمارتیں بڑی شاندار تھیں جو مشرقی اور مغربی فن تعمیر کا حسین امتزاج تھیں۔ طلبہ اور اساتذہ کے درمیان مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ اس کالج کی بدولت مسلمان زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کرنے لگے۔ علی گڑھ محض تعلیمی ادارہ نہیں تھا بلکہ ایک عظیم تحریک کا مظہر تھا جس نے مسلمانوں کی زندگی کے سماجی، معاشی، سیاسی، ادبی اور مذہبی پہلوؤں کو براہ راست متاثر کیا۔

سرسید کی دلی تمنا تھی کہ کالج جلد از جلد ایک خود مختار یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلے مگر حکومت اس راہ میں مزاحم تھی۔ 1894ء میں سرسید نے فرمایا: "دوستو ہماری تعلیم اس وقت مکمل ہوگی جب یہ تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے نجات ملے گی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا تاج سر پر ہوگا"۔

iv- تعلیمی کمیٹی

انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا تا کہ مسلمانوں کو تعصبات کے خول سے نکالا جائے۔ انہوں نے دسمبر 1870ء میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے بنارس میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم کی جس نے برِصغیر کے مسلم مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کو تعلیمی مسائل پر لکھنے کی دعوت دی۔

v- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

سرسید احمد خان کا ایک خواب علی گڑھ کالج کی شکل میں پورا ہو چکا تھا مگر وہ کروڑوں فرزندانِ توحید کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے سے قاصر تھا۔ سرسید چاہتے تھے کہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام ہو۔ اس غرض سے انہوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی جس کا پہلا اجلاس 17 دسمبر 1886ء کو ہوا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس خالصتاً ایک غیر سیاسی تنظیم تھی لیکن مسلم لیگ کے قیام تک اس نے مسلمانوں کو سیاسی اور غیر سیاسی میدانوں میں رہنمائی فراہم کی۔ دسمبر 1906ء میں مسلم لیگ نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا۔

تحریک علی گڑھ کے اثرات

تحریک علی گڑھ نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ چھوڑا جس کی بہتری اور اصلاح کی اس نے کوشش نہ کی ہو۔ اصلاح معاشرہ و معاشرت اس کے بنیادی مقاصد تھے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک اور سیاسی نظریات نے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو یکجا کر دیا۔

تحریک علی گڑھ کے اثرات کا اجمالی جائزہ پیش ہے۔

i- مغربی تعلیم کا فروغ

تحریک علی گڑھ بنیادی طور پر ایک تعلیمی اور تمدنی تحریک تھی۔ اس کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی ترویج اور ان کی معاشی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح تھا۔ سرسید اس مقصد کے حصول میں کامیاب رہے۔ علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا نیز علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہو کر برصغیر کے مسلمانوں نے جگہ جگہ سکول اور کالج کھولے اور مسلمانوں کو تعلیم کی طرف رغبت دلائی۔ سرسید کی کوششوں سے تعلیم یافتہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں قبول کئے جانے لگے۔ اس طرح ان کی دیرینہ مشکلات کا بہت حد تک ازالہ ہوا۔

ii- انگریزوں کے ساتھ مصالحت

جنگ آزادی کے نتیجے میں مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی حالت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ انگریز ان کو اپنا غلام بنا کر ان کی مکمل تباہی کے خواہاں تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی تھی۔ سرسید احمد خاں نے اس صورت حال کا بڑے ٹھنڈے دماغ سے مقابلہ کیا۔ معاشرتی اصلاح کے میدان میں سرسید کا عظیم کارنامہ انگریزوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی بحالی ہے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" میں انہوں نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا وہ کسی اور لیڈر کے حصے میں نہیں آئی۔ انہوں نے اہل مغرب کو یقین دلایا کہ انھوں نے اسلام کو غلط سمجھا ہے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کے خیالات کو بدلنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے۔

iii- مسلم اتحاد

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کو مسائل حل کرنے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ اس ضمن میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے بنیادی کردار ادا کیا۔ علی گڑھ کالج کے طالب علم علاقائی تعصب سے پاک تھے۔ ان کا دل قومی خدمت کے جذبے سے معمور تھا۔ برصغیر کے ہر خطہ کا مسلمان علی گڑھ کالج کو اپنا قومی سرمایہ تصور کرتا تھا۔ اس اتحاد فکر و عمل نے مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

iv- ذاتی کردار سازی

علی گڑھ کالج نے مسلمان طالب علموں کی کردار سازی پر بڑا زور دیا۔ ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے علاوہ ان کے اخلاق وعادات کی تربیت کی جاتی تھی۔ اس ضمن میں حفظ مراتب اور رکھ رکھاؤ کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور ان کو منظم زندگی بسر کرنے کا عادی بنایا جاتا تھا۔ ان باتوں کا عام مسلمانوں پر بھی اثر پڑا۔ اسی وجہ سے مسلمان تعلیمی اداروں میں نظم وضبط کے بارے میں علی گڑھ کالج کی پیروی کی جانے لگی۔

v- جدید قیادت

علی گڑھ نے مسلمانوں کو قیادت فراہم کی جو مسلمانوں کی بھلائی کے لیے کوشاں رہی۔ اس صدی کے دوسرے عشرے میں مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر میں جو انقلابی تبدیلی رونما ہوئی وہ اسی قیادت کی مرہون منت تھی۔ تحریک پاکستان کے قائدین میں بھی علی گڑھ کے طلبہ ہی سرفہرست ہیں۔

vi- دین کا محدود تصور

جب سرسید احمد خان نے اپنی تعلیمی تحریک شروع کی تو ان کا عزم یہ تھا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر ہوگا۔ لہٰذا انھوں نے دینیات کو ہر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی قرار دیا۔ نماز اور روزہ کی پابندی پر سختی سے عمل کیا لیکن علی گڑھ دینی میدان میں بہت سی توقعات کو پورا نہ کر سکا۔

vii- تحریک پاکستان کا قلعہ

سرسید احمد خان کو تحریک پاکستان کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کے کالج نے برصغیر کے مسلمانوں میں قومیت کی نئی روح پھونک دی جس سے مسلمان اتحاد پیدا ہوا اور اسی اتحاد کے سبب تحریک پاکستان وجود میں آئی جس کو پروان چڑھانے کے لئے علی گڑھ کے طلبہ نے تن من دھن کی بازی لگادی۔ سرسید احمد خان ہندو اور مسلمانوں کو بڑی قومیں تسلیم کرتے تھے اور جب آزادی ملی تو برصغیر ان ہی دو قوموں میں بٹ گیا۔ اس ادارے کے طلبہ نے مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑی اور فتح وکامرانی سے ہمکنار ہوئے۔

viii- اردو زبان کا فروغ

تحریک علی گڑھ سے اردو زبان کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ عربی اور فارسی کے سرکاری طور پر خاتمے کے بعد مسلمانوں میں باہمی رابطہ کی زبان اور ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو کو بہت نمایاں مقام حاصل ہوا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے بیشتر ساتھیوں نے اپنے مضامین

اور تقاریر میں اردو کا ہی استعمال کیا۔ اس طرح اس زبان میں وسیع علمی اور ادبی ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ہندوؤں کی مخالفت کے باعث بھی اُردو کو مسلمانوں کی زبان کا درجہ حاصل ہوتا گیا۔

ix- مسلمانوں کی معاشی خوش حالی

علی گڑھ تحریک کے شروع ہونے کا ایک سبب مسلمانوں کی معاشی بد حالی بھی تھا۔ تعلیم حاصل نہ کرنے کے باعث وہ ملازمتوں سے محروم ہو رہے تھے۔ علی گڑھ کی تحریک نے اس صورت حال کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کی بدولت وہ سرکاری ملازمتوں کے حصول میں کامیاب ہوئے اور مختلف کاروبار کرنے کے قابل ہو گئے۔ ملازمتوں میں کوٹے کے باعث بھی ان کی معیشت پر اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

x- تعلیمی اداروں کا قیام

تحریک علی گڑھ کو دیکھتے ہوئے پورے ہندوستان میں تعلیم اور تعلیمی اداروں کو فروغ حاصل ہوا۔ مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف تنظیمیں بنائیں۔ پنجاب میں انجمن حمایت اسلام اور انجمن اسلامیہ پنجاب، سندھ میں سندھ محمڈن ایسوسی ایشن اور انجمن اسلام بمبئی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ ان تنظیموں نے ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی ادارے قائم کیے۔ جنھوں نے ملک میں آزادی سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد نمایاں تعلیمی خدمات سرانجام دیں۔

اہم نکات

1- برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں تعلیم عام، مفت اور بلند معیار کی تھی۔ مسلمان سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔

2- انگریز جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں تاجر کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تھے، 1757ء کی جنگِ پلاسی سے 1857ء کی ناکام جنگِ آزادی تک پورے برصغیر کے حکمران بن گئے۔

3- برطانوی نظام تعلیم کا مقصد حکومتِ برطانیہ کے لیے وفادار ملازمین کی فراہمی اور عیسائیت کا فروغ تھا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نصابِ تعلیم اور امتحانی نظام وضع کیا گیا۔

4- انگریزوں کے جاری کردہ نظام کو نہ اپنانے سے مسلمان تعلیمی اور سماجی پس ماندگی کا شکار ہو گئے۔ ان حالات نے مسلمانوں میں تعلیمی تحریکات کو جنم دیا۔

5- سرسید احمد خان کی نظر میں سب سے بڑا مقصد انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان بے اعتمادی کی فضا ختم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے لیے تیار کرنا تھا۔

6- تحریک دیوبند کا مقصد اسلامی عقائد کو محفوظ رکھنا اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا۔

آزمائشی مشق

حصّہ معروضی:

I- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سب سے موزوں ترین جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

i- برطانوی پارلیمنٹ نے مشینری کلاز کی ایک شق منظور کی جس کی رو سے کمپنی کو پابند کیا گیا کہ وہ فیکٹریوں اور بحری جہازوں پر عیسائیت کی تبلیغ کا بندوبست کرے اور سکول قائم کرے:

ا۔ 1765ء میں ب۔ 1698ء میں ج۔ 1757ء میں د۔ 1946ء میں

ii- کس کو برصغیر کے موجودہ نظامِ تعلیم کا بانی کہا جاتا ہے؟

ا۔ میکالے ب۔ رابرٹ براؤن ج۔ چارلز گرانٹ د۔ ماؤنٹ بیٹن

iii- 1866ء میں سہارن پور قصبے دیو بند میں دار العلوم قائم کیا:

ا۔ سید احمد شہیدؒ نے ب۔ شاہ ولی اللہؒ نے ج۔ محمد قاسم نانوتویؒ نے د۔ سر سید احمد خان نے

iv- سائنٹیفک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام 13 مارچ 1866ء سے ایک ہفت روزہ اخبار نکلنا شروع ہوا جس کا نام تھا۔

ا۔ سائنٹیفک ب۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ج۔ کامریڈ د۔ مسلم ایجوکیشنل جرنل

v- آل انڈیا مسلم لیگ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے وجود میں آئی:

ا۔ 1930ء میں ب۔ 1905ء میں ج۔ 1906ء میں د۔ 1940ء میں

vi- 1870ء میں بنارس میں سر سید احمد خان نے تعلیمی کمیٹی قائم کی:

ا۔ دسمبر 1870ء میں ب۔ ستمبر 1870ء میں ج۔ اکتوبر 1870ء میں د۔ نومبر 1870ء میں

II- ذیل میں چند بیانات درج ہیں۔ بیان صحیح ہونے کی صورت میں "ص" اور غلط ہونے کی صورت میں "غ" کے گرد دائرہ لگائیں۔

i- برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل مسلمانوں کے دورِ حکومت میں تعلیم عام اور مفت تھی۔ ص / غ

ii- برصغیر میں مسلم دورِ حکومت میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ سکول قائم تھے۔ ص / غ

iii- حکومت برطانیہ نے برصغیر پاک و ہند پر 1857ء سے لے کر 1947ء تک حکومت کی۔ ص / غ

iv- برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی حکمت عملی پر مکمل عمل درآمد برطانوی دورِ حکومت میں ہوا۔ ص / غ

v- برصغیر پاک و ہند کے موجودہ تعلیمی نظام کے بانی کے طور پر لارڈ میکالے کا نام لیا جاتا ہے۔ ص / غ

vi- انگریزوں نے برصغیر میں ایک الحادی نظام تعلیم قائم کیا۔ ص / غ

vii- برصغیر میں برطانوی تعلیم کا اہم مقصد اپنی حکومت کے لیے وفادار ملازمین کا حصول تھا۔ ص / غ

viii- ووڈزڈسپیچ میں عربی اور سنسکرت کی تعلیم کے فروغ کی سفارش کی گئی تھی۔ ص / غ

ix- برصغیر میں مسلمانوں کی ہر سیاسی تحریک کے پیچھے کسی نہ کسی مذہبی، نظریاتی یا تعلیمی تحریک کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ ص / غ

x- تحریک دیوبند دراصل مسلمانوں کے اُس طبقہ کی نمائندہ تھی جس کے نزدیک مغربی افکار اور مغربی تعلیم نا قابل قبول تھی۔ ص / غ

xi- مسلمانوں کا وہ طبقہ جو حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے مغربی تعلیم حاصل کر کے سیاسی آزادی کی جدوجہد کرتا رہا تحریک علی گڑھ کی نمائندگی کرتا تھا۔ ص / غ

xii- تحریک دیوبند سید احمد شہیدؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے نظریات کا ہی تسلسل تھی۔ ص / غ

III- خالی جگہ پُر کریں:

i- مشنری مبلغ ولیم آدم کے مطابق صوبہ بنگال اور بہار میں انگریزی حکومت کے آغاز کے وقت سکولوں کی تعداد قریباً.................. تھی۔

ii- ایسٹ انڈیا کمپنی.................. ء میں جنگِ پلاسی کے بعد ایک حکمران طاقت بن کر اُبھری۔

iii- 1813ء کا.................. ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم کے لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

iv- 1823ء میں.................. نے فیصلہ کیا کہ کمپنی کی طرف سے مخصوص رقم کا کچھ حصہ مشرقی علوم کی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔

v- برطانوی نصاب تعلیم میں انگریزی کو.................. جماعت سے بی۔ اے تک لازمی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔

vi- دیوبند دارالعلوم کے قیام کا بنیادی مقصد.................. کا تحفظ تھا۔

vii- 1852ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کی طرف سے دوسو چالیس ہندوستانیوں کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت ملی جس میں مسلمانوں کی تعداد.................. تھی۔

viii- سرسید احمد خان نے غازی پور میں 1864ء کو ایک ادارے کی بنیاد رکھی جس کا نام.................. رکھا گیا۔

IV- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں:

i- برصغیر میں تعلیمی تبدیلیوں کے چار اَدوار بیان کریں۔

ii- 1813ء کے چارٹر ایکٹ کی نمایاں دفعات لکھیں۔

iii- 1882ء میں سر ولیم ہنٹر کی سربراہی میں قائم ہونے والے انڈین ایجوکیشن کمیشن کی سفارشات بیان کریں۔

iv- 1905ء سے لے کر 1917ء تک کے اہم تعلیمی واقعات کی فہرست بنائیں۔

v- برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کے مقاصد بیان کریں۔

vi- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد لکھیں۔

vii- تحریک علی گڑھ کی کوئی چار علمی خدمات بیان کریں۔

viii- جنوبی ایشیاء میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات کی فہرست بنائیں۔

ix- ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی پالیسی سے کیا نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

V- درج ذیل میں کالم (ا) اور کالم (ب) میں درج الفاظ میں باہمی تعلق معلوم کر کے کالم (ب) کے سامنے کالم (ج) میں مطلوبہ الفاظ درج کریں۔

کالم (ا)	کالم (ب)	کالم (ج)
1- پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔	1-1813ء کا ایکٹ۔	
2- ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی۔	2- چارلز گرانٹ	
3- انگریزی نظام تعلیم کے لیے سنگ بنیاد ہے۔	3-1882ء	
4- جنوبی ایشیا میں تعلیمی پالیسی کا بانی	4-1841ء	
5- تعلیم عامہ کمیٹی ختم کردی۔	5- مغربی علوم کا فروغ	
6- سرکاری تعلیم کا مقصد	6- 1836ء	
7- تحریک دیوبند کے مدرسے کا آغاز کیا	7- 7 مارچ 1835ء	
8- 1866ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام ہفت روزہ اخبار شائع ہوا۔	8- 17 دسمبر 1886ء	
9- ہگلی کالج کلکتہ اور میڈیکل کالج کلکتہ کا قیام عمل میں آیا	9- مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ	
10- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی۔	10- ہندوستانیوں کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم مختص کی جائے گی۔	

حصہ انشائیہ

VI- انگریزوں کی آمد کے وقت برصغیر کی تعلیمی حالت پر بحث کریں۔

VII- 1854ء تا 1905ء کے دور میں تعلیمی پالیسی پر روشنی ڈالیں۔

VIII- برصغیر میں برطانوی نظام تعلیم کی طرف سے تجویز کردہ نصاب تعلیم پر روشنی ڈالیں۔

IX- تحریک دیوبند پر مفصل نوٹ تحریر کریں۔

X- تحریک علی گڑھ کے اسباب اور علمی خدمات کا جائزہ پیش کریں۔

XI- برصغیر میں رائج کردہ برطانوی نظام تعلیم کے مقاصد بیان کریں۔

XII- تحریک علی گڑھ کے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی پر اثرات کے بارے میں بحث کریں۔

XIII- ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی پالیسی بیان کریں۔

پاکستان کی تعلیمی پالیسیاں اور منصوبے
(Educational Policies and Plans of Pakistan)

دنیا کی تمام قومیں اپنی امنگوں اور مستقبل کی ضروریات کو تعلیمی پالیسی اور تعلیمی منصوبہ بندی کی بنیاد بناتی ہیں۔ تعلیمی پالیسی میں جو مقاصد اور اہداف طے کیے جاتے ہیں ان کے حصول کے لیے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ منصوبے میں طے کیا جاتا ہے کہ مقررہ مدت کے اندر طے شدہ اہداف کے حصول کے لیے کس قدر وسائل کی ضرورت ہوگی اور ان کا حصول کیسے ممکن بنایا جائے گا۔ ہر قوم کے اپنے تہذیبی اور تعلیمی مقاصد مستقل ہوتے ہیں اور یہ ہمیشہ ملکی آئین کے تابع ہوتے ہیں۔ ملکی آئین جس تہذیب کو مقصد حیات قرار دیتا ہے وہی اس ملک کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کا مقصد حیات بن جاتی ہے۔ ان تمام شعبوں کی افرادی ضروریات پوری کرنا تعلیم کا ایک بنیادی فریضہ ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جہاں تعلیم کو نظریہ پاکستان کے استحکام کا وسیلہ بننا چاہیے۔ پاکستان میں اس ضرورت کا احساس ہمیں قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ نے پہلی تعلیمی کانفرنس 1947ء کے نام اپنے پیغام میں یوں دلایا۔ ''اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا چاہیے جو ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ہوں اور ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہوں''، تعلیم نظریہ پاکستان کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی طلبہ کو قیام پاکستان کے مقاصد سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ قوم میں اتحاد و یگانگت، یکجہتی اور جذبہ حریت برقرار رکھنے اور اسلام کے بنیادی عقائد و اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تعلیم مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے۔

پاکستان اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد پر قائم ہوا۔ پاکستان کے حصول کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہاں زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی نظریہ حیات کو نافذ کر دیا جائے۔ اسی لیے قیام پاکستان سے اب تک بننے والی تمام پالیسیوں میں اسلامی نظریہ حیات کو مقاصد تعلیم کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ذیل میں نظریہ پاکستان کا تعلیمی مفہوم اور تمام تعلیمی پالیسیوں کی اہم سفارشات نوٹ کی گئی ہیں۔

نظریہ پاکستان کا تعلیمی مفہوم

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش کی بنیاد نظریاتی اختلاف تھا۔ مسلمان اسلامی نظریہ حیات پر ایمان رکھتے ہیں جبکہ غیر مسلم اس پر یقین نہیں رکھتے۔ یہی ایمان نظریہ پاکستان کی بنیاد ہے اور یہی تحریک پاکستان کا محرک بنا۔ تحریک پاکستان کے دوران ہر مسلمان کا ایک ہی نعرہ تھا۔

پاکستان کا مطلب کیا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ نظریہ پاکستان کا صحیح مفہوم جاننے کے لیے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا مفہوم سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہ کلمہ توحید کا بنیادی جزو ہے جس کے معنی یہ ہیں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمام انسانوں کو صرف اللہ کے قانون یعنی قرآن کریم کی پابندی کرنی چاہیے اور اپنی زندگی کو اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ دنیا میں بسنے والے تمام لوگ دو قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ کے قانون کو ماننے والے ملّتِ اسلامیہ اور نہ ماننے والے ملتِ کفر۔ یہی دو قومی نظریہ ہے جو تحریک پاکستان کی بنیاد بنا اور اسی کی بنیاد پر پاکستان حاصل ہوا۔

علامہ اقبالؒ نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے آزاد ریاست کے قیام پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اسلام کے ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقے میں اس کی مرکزیت قائم ہو۔''

علامہ اقبالؒ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ان کا دین ہے۔ وطن، زبان اور نسل ان کی قومیت کی بنیاد نہیں۔ آپؒ نے فرمایا ''مسلمانوں اور دیگر اقوام عالم میں امتیازی فرق یہ ہے کہ اسلام کا تصور قومیت نہ وطنی ہے نہ لسانی نہ نسلی۔''

مسلمانوں کی یہ سوچ اور تصور نظریہ پاکستان کی بنیاد بنا۔ قائداعظمؒ نے ایک موقع پر اسی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ''ہم ایک علیٰحدہ قوم ہیں جن کے پاس اپنا خاص تہذیب وتمدن، زبان، فنون لطیفہ، عدالتی قانون اور ضابطۂ اخلاق، رواج، سن، تاریخ، روایات، رجحانات اور امنگیں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی اور اس کے متعلق ہم ایک خاص تصور رکھتے ہیں اور بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک علیٰحدہ قوم ہیں''۔ تعلیم استحکام پاکستان کے لیے اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی پاکستانی قوم میں اتحاد و یگانگت، یکجہتی اور جذبۂ حریت برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

نظریہ پاکستان کا مفہوم کے حوالے سے تعلیمی مقاصد، تعلیمی نصاب، انداز تدریس اور جائزے کے طریقے اس طرح ترتیب دیے جائیں کہ وہ دوقومی نظریہ اور استحکام پاکستان کی بنیاد بن سکیں۔

قومی تعلیمی پالیسیاں

ہر ملک اپنی تعلیمی پالیسی کے مقاصد اپنے نظریہ حیات کے مطابق طے کرتا ہے۔ پاکستان کی تمام تعلیمی پالیسیوں میں بانی پاکستان قائداعظمؒ کے فرمان کو ملحوظ رکھا گیا اور اسلامی نظریہ حیات کو مقاصد تعلیم کی بنیاد بنایا گیا۔ تمام پالیسیوں کے مقاصد میں عمومی طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قومی تعلیمی پالیسی ایک دفعہ طے ہوجانے کے بعد اس کے مقاصد کے حصول کے لیے مختصر مدت کے تعلیمی ترقی کے منصوبے بنائے جاتے اور حکومت کی تبدیلی کے ساتھ تعلیمی پالیسی تبدیل نہ ہوتی۔ تاہم پاکستان میں بننے والی تعلیمی پالیسیوں میں دیے گئے یکساں عمومی مقاصد کا خلاصہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔

مقاصد تعلیم

1- طلبہ کو اسلامی نظریہ حیات کے زریں اصولوں کے مطابق ذمہ دار اور تعلیم یافتہ شہری کی حیثیت سے قومی اور بین الاقوامی کردار ادا کرنے کے قابل بنانا۔

2- عمومی ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغاں کے وسیع پروگرام کے تحت کم سے کم مدت میں ناخواندگی کو ختم کرنا اور خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔

3- قومی اتحاد اور یک جہتی کو فروغ دینا۔

4- فرد اور معاشرے کی نشوونما اور جمہوریت کو فروغ دینا۔

5- نصاب اور درسی کتب کو ملکی ضروریات کے مطابق ازسرنو مرتب کرنا۔

6- نظریہ پاکستان کا تحفظ کرنا اور اسے انفرادی اور قومی زندگی کا لائحہ عمل بنانا۔

7- صنعتی ترقی اور پاکستان کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے اور خود کفالت کے لیے تربیت یافتہ افرادی قوت تیار کرنا۔

8- طلبہ اور اساتذہ کی بہتری کے لیے تربیتی اور فلاحی پروگرام تشکیل دینا۔

تعلیمی پالیسی 1998-2010 کے مطابق تعلیم کے درج ذیل مقاصدِ تعلیم مقرر کیے گئے ہیں:

1- نصاب کو قرآن اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ڈھالنا۔

2- رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کو عام کرنا تاکہ ترک مدرسہ کی شرح میں کمی ہوسکے۔

3- ہر بچے کو یکساں طور پر تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کرنا۔

4- ایسے تمام بچے اور بچیاں جو ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں انھیں سکولوں تک پہنچانے کے انتظامات کو یقینی بنانا۔

5- معاشی اور صنعتی ترقی کے لیے طلبہ کو پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کے حصول کے لیے تیار کرنا۔

6- تدوین نصاب کے عمل کو مسلسل جاری رکھنا۔

7- انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کو کمرہ جماعت میں موثر تعلّم کے لیے استعمال کرنا۔

8- دوران ملازمت اساتذہ کے لیے تربیت کا اہتمام کرنا۔

9- ملک میں بے روزگاری ختم کرنے کے لیے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو بہتر بنانا۔

10- غریب اور نادار طلبہ کی مفت تعلیم کے لیے نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کرنا۔

11- تعلیمی معیار میں بہتری کے لیے ہر سطح پر جائزے کے نظام کو بہتر بنانا۔

12- اعلیٰ تعلیم کو بین الاقوامی معیار پر لانے کے لیے تحقیق کے شعبہ میں وسعت پیدا کرنا۔

13- تربیت اساتذہ کے لیے ایک موثر ڈھانچہ تشکیل دینا۔

قیام پاکستان سے اب تک بننے والی تمام تعلیمی پالیسیوں کے عمومی مقاصد تعلیم پچھلے صفحات پر درج ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے آئندہ صفحات میں تعلیمی پالیسیوں میں پائی جانے والی یکساں نوعیت کی سفارشات اور پروگراموں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف نئے اور اہم پروگرام اور سفارشات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تعلیمی کانفرنس 1947ء

14 اگست 1947ء کے بعد پاکستان ایک خودمختار اسلامی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ پاکستان کے قیام کا مقصد برصغیر کی تقسیم نہ تھا بلکہ مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے مسلمان قوم کی تشکیل تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ قیام پاکستان سے پہلے یہ تمام علاقہ برطانوی حکومت کے ماتحت تھا۔ برطانوی حکومت کی تمام تعلیمی پالیسیاں ایک غلام قوم کے لیے تھیں۔ برطانوی نظام تعلیم نے ہمارے تعلیم یافتہ افراد میں احساس کمتری اس حد تک پیدا کر دیا کہ انھیں انگریز حاکموں کی ہر ادا بھلی معلوم ہونے لگی۔ اس نظام تعلیم نے ایک غلامانہ ذہنیت کو جنم دیا جس سے تعلیم یافتہ مسلمان اپنی ثقافت سے دور ہونے لگے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کو برطانوی نظام تعلیم میں پائی جانے والی خرابیوں کا پوری طرح احساس تھا۔ آپ نے 11 اکتوبر 1947ء کو پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم رائج کرنے کے لیے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

"پاکستان جس کے لیے ہم پچھلے دس سال سے کوشش کر رہے تھے، خدا کا شکر ہے ایک مسلمہ حقیقت بن گیا ہے لیکن ایک نئی مملکت کا قیام ہی ہمارے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ خیال یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں جہاں ہم اپنی روایات اور تمدن کے مطابق ترقی کر سکیں اور جہاں اسلام کے عدل و مساوات کے اصولوں کو آزادی سے برسرِ عمل آنے کا موقع حاصل ہو۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کا نظام تعلیم بھی اس عقیدے کے پیشِ نظر استوار کیا جائے۔"

قیام پاکستان کے فوراً بعد نئی مملکت کو گوناگوں مسائل درپیش تھے جن میں مہاجرین کی آبادکاری، پاکستان کا دفاع، کشمیر کا مسئلہ، حکومت کو چلانے کے لیے مادی وسائل کی کمی جیسے مسائل سرفہرست تھے لیکن بابائے قوم نے اس مشکل مرحلہ میں بھی تعلیم کو اس کی اہمیت کے پیش نظر اوّلیت دی اور ایک تعلیمی کانفرنس کے انعقاد کی ہدایت کی۔ چنانچہ یہ پہلی تعلیمی کانفرنس 27 نومبر 1947ء کو کراچی میں شروع ہوئی اور یکم دسمبر 1947ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس کے انعقاد میں قائداعظمؒ نے ذاتی طور پر دلچسپی لی لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر خود شرکت نہ کر سکے۔ البتہ ان کا پیغام افتتاحی اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1- ہمیں بحیثیت ایک آزاد اور اسلامی نظریہ کی حامل قوم کے اپنے نظام تعلیم کو اپنی تاریخ وثقافت اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔
2- دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی تعلیمی ترقیوں پر نظر رکھنا چاہیے۔
3- تعلیم صرف کتابی اور نظری علوم کے حصول کا نام نہیں بلکہ عملی، سائنسی وفنی علوم پر توجہ دینی چاہیے۔
4- تعلیم کے ذریعے اپنی نئی نسل کے کردار کی اس انداز میں تربیت کرنا کہ ان میں عزت نفس، دیانت داری، احساس ذمہ داری، ایثار وقربانی اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔
5- تعلیم کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں میں ماہرین اور تربیت یافتہ افراد کو آگے لانا تاکہ پاکستان ترقی کر سکے۔

تعلیمی کانفرنس سے وزیر تعلیم کا خطاب

اس وقت کے وزیر تعلیم فضل الرحمان نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ وہ تعلیم میں روحانی عنصر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اگر اس عنصر کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے خطرناک اور تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے۔ جدید تعلیم کا المیہ دو عظیم جنگوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ان جنگوں اور وسیع سائنسی ایجادات نے ہمیں یہ سبق دیا کہ اگر سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی اخلاق اور روحانیت کی ترقی کو فراموش کر دیا جائے تو نسل انسانی کی تباہی یقینی ہے۔

جمہوریت اور شہریت کی تربیت کے سلسلے میں آپ نے فرمایا کہ شہری کے لیے اپنے حقوق وفرائض کا جاننا بہت ضروری ہے۔ کسی ایسے شخص کو ووٹ کے استعمال کا حق دینا جسے شہری کے حقوق وفرائض کا علم نہ ہو ایسے ہی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں بارود دے دیا جائے۔ ووٹ کا غلط استعمال بدعنوانی اور سیاسی عدم استحکام کو جنم دیتا ہے۔ تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جمہوریت کے چلانے کے لیے لوگوں میں احتساب کی قوت پیدا کرے۔

قومی اتحاد واستحکام کو بھی واضح کیا اور صوبائی عصبیت کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا "بدقسمتی سے ہمارے عوام پنجابی، سندھی، بلوچی، بنگالی اور پٹھان ہونے پر فخر کرتے رہے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے افسوس ناک ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے اس تعصب کو ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ تعصبات پاکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمیں صرف پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے اور قومی اتحاد کے سلسلے میں ہماری وفاداری ناقابل تقسیم ہو۔"

تعلیمی کمیٹیوں کا قیام

وزیر تعلیم کی تقریر کے بعد کانفرنس کے شرکا کو دس سب کمیٹیوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان کمیٹیوں کے ذمے تعلیم کے مختلف شعبوں کی ترقی کا جائزہ لینا اور بہتری کے لیے سفارشات پیش کرنا تھا۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر سفارشات مرتب کی گئیں۔ ذیل میں ان سفارشات کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

☆ نظریہ پاکستان کا تحفظ

قومی نظریہ، قومی نظام تعلیم کی اساس ہوتا ہے۔ چونکہ پاکستان کے قیام کی بنیاد اسلام اور دو قومی نظریہ پر تھی اس لیے سفارش کی گئی کہ نظریہ پاکستان تعلیم کی بنیاد ہو کیونکہ اس کے بغیر ہم اس نظریاتی مملکت کی بنیادیں مستحکم نہیں بنا سکتے۔ پہلی تعلیمی کانفرنس میں یہ سفارش کی گئی کہ نظریۂ پاکستان کو نئی نسل کے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے اسلام کی بنیادی تعلیم از حد ضروری ہے۔ کانفرنس نے سفارش کی کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے تمام سکولوں میں دینی تعلیم کی لازمی تدریس کا اہتمام کیا جائے۔ ارکان اسلام کی عملی تربیت کا نفاذ ضروری ہو۔ چونکہ پاکستان میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتیں بھی ہیں اس لیے ان اقلیتوں کو بھی ان کے نظریہ حیات اور مذہب کے مطابق تعلیم دی جائے۔

☆ لازمی تعلیم

اس کانفرنس نے ملک میں ہمہ گیر لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم کا انتظام کرنے کی سفارش کی اور کہا کہ ملک میں ناخواندگی، پسماندگی اور جہالت کے خاتمے کے لیے ہمہ گیر لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم کا بندوبست نہایت ضروری ہے۔ ابتدائی تعلیم سے متعلقہ کمیٹی نے سفارش کی کہ ابتدائی تعلیم کی مدت پانچ سال ہو جسے بعد میں بڑھا کر آٹھ سال کر دیا جائے۔ ابتدائی تعلیم کے اداروں کے اساتذہ کے لیے مختصر مدت کے تربیتی کورسز کا اجرا کیا جائے۔

☆ تعلیم بالغاں

پاکستان میں آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ایسے بالغ افراد پر مشتمل ہے جو لکھنا، پڑھنا نہیں جانتے۔ ایسے ناخواندہ افراد ملک کی مجموعی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ ملک سے مکمل طور پر جہالت اور ناخواندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے تعلیم بالغاں کے مختلف پروگرام شروع کرنے کی سفارش کی گئی۔

شہریت کی تربیت

پاکستان ایک جمہوری ملک ہے۔ حقوق و فرائض سے آگاہی جمہوریت کی بنیاد ہے۔ تعلیمی کانفرنس میں سفارش کی گئی کہ بچوں میں نظم وضبط، دیانتداری، حب الوطنی، احساس ذمہ داری اور معاشرتی خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے انھیں شہریت کی تعلیم دی جائے۔

ذریعہ تعلیم

پہلی تعلیمی کانفرنس میں سفارش کی گئی کہ صوبوں میں پرائمری سطح تک ذریعہ تعلیم صوبائی زبانیں ہو سکتی ہیں لیکن پورے ملک میں اُردو کو قومی زبان کی حیثیت سے لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔ مڈل اور ہائی سطح میں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اعلیٰ تعلیم میں انگریزی کو ناگزیر برائی کے طور پر کچھ عرصہ جاری رکھنے کی سفارش کی گئی۔

انگریزی کا مقام

کانفرنس نے ایک اہم سفارش یہ کی کہ انگریزی کو رفتہ رفتہ بطور ذریعہ تعلیم ختم کر دیا جائے اور اعلیٰ تعلیم بھی قومی زبان میں دی جائے۔

تعلیم نسواں

پاکستان میں خواتین کی شرح خواندگی مردوں سے بہت کم تھی۔ دیہات میں خواتین کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ کانفرنس میں تعلیم نسواں کو خاص اہمیت دی گئی اور اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ لڑکیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ ابتدائی مدارس میں لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھی تعلیم دی جائے لیکن سکول اور کالج کی سطح پر ان کی تعلیم کا الگ الگ انتظام کیا جائے۔ خواتین اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ اس کے علاوہ خواتین کے لیے الگ میڈیکل کالجز قائم کیے جائیں۔

☆ سائنسی اور فنی تعلیم

1947ء کی تعلیمی کانفرنس میں سائنسی اور فنی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی سفارش کی گئی اور یہ طے پایا کہ ایک سائنٹیفک انڈسٹریل ریسرچ کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ وہ ملک میں سائنسی اور فنی تعلیم کے مقاصد طے کرے اور بہتری کے لیے سفارشات پیش کرے۔

☆ اساتذہ کی تربیت

تعلیمی کانفرنس میں تربیت اساتذہ کے سلسلے میں سفارش کی گئی کہ ابتدائی تعلیم کے لیے جتنے اساتذہ کی ضرورت ہے اس کا اندازہ لگایا جائے اور ان کی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ اساتذہ کی تنخواہوں پر نظر ثانی کی جائے اور اچھی کارکردگی دکھانے والے اساتذہ کو انعامات دیے جائیں نیز "پاکستان اکیڈمی" کے نام سے تربیت اساتذہ کے لیے ایک قومی ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے۔

1947 کی تعلیمی کانفرنس ایک مکمل تعلیمی پالیسی تو نہ دے سکی لیکن آئندہ کے لیے یہ طے ہو گیا کہ ملکی نظام تعلیم کی بنیاد اسلامی نظریہ حیات پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔

تعلیمی کانفرنس کی سفارشات پر عمل درآمد کے لیے 1951 میں چھ سالہ منصوبہ بنایا گیا۔ نئے تعلیمی ادارے کھولنے اور تعلیمی ترقی کے نئے پروگراموں کے لیے تعلیمی اخراجات کا جو اندازہ لگایا گیا، ملکی وسائل ان اخراجات کے متحمل نہیں تھے۔ اس لیے اس منصوبہ پر مکمل طور پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

قومی تعلیمی کمیشن 1959ء

اکتوبر 1958ء میں فوجی انقلاب کے بعد فیلڈ مارشل ایوب خان نے تعلیم میں اصلاحات کے لیے تعلیمی کمیشن قائم کیا۔ کمیشن نے اس وقت کے سیکرٹری تعلیم ایس۔ ایم۔ شریف کی سربراہی میں اپنی رپورٹ اگست 1959 میں صدر پاکستان کو پیش کر دی۔ کمیشن نے ٹھوس تجاویز پیش کیں جو تسلیم کر لی گئیں۔ اہم تجاویز درج ذیل ہیں:

رہنمائی اور مشاورت کا پروگرام

طلبہ کی بہبود اور رہنمائی کے لیے طے کیا گیا کہ ہر ثانوی، فنی اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے میں رہنمائی اور مشاورت کا شعبہ قائم کر کے وہاں ایک راہنما مشیر کا تقرر کیا جائے تاکہ بلا سوچے سمجھے اور بے مقصد تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی رہنمائی کی جا سکے اور وہ ایسی تعلیم حاصل کریں جو خود طلبہ اور ملک کے لیے مفید ہو۔

نظام امتحانات

کمیشن نے طلبہ میں محنت کی عادت پیدا کرنے کے لیے رٹہ بازی کی سخت مخالفت کی اور نظام امتحانات از سرنو ترتیب دیا۔ کمیشن نے سفارش کی کہ 25 فیصد نمبروں کے لیے داخلی امتحان لیے جائیں اور 75 فیصد نمبروں کا امتحان یونیورسٹی لے۔ دونوں طرح کے امتحانات میں الگ کامیابی ضروری ہو۔ امتحان میں کامیابی کے لیے ہر مضمون میں 40 فیصد نمبر ضروری ہوں اور پاس ہونے کے لیے مجموعی طور پر 50 فیصد، سیکنڈ ڈویژن کے لیے 60 فیصد اور فرسٹ ڈویژن 70 فیصد نمبروں پر دی جائے تاکہ معیار تعلیم بلند ہو سکے۔

ڈگری پروگرام

کمیشن کی سفارش پر بی۔ اے کے ڈگری پروگرام کا دورانیہ دو سال سے بڑھا کر تین سال کر دیا گیا مگر اساتذہ، طلبہ اور ان کے والدین کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آیا، جس کے نتیجے میں ڈگری کا دورانیہ پھر دو سال کر دیا گیا۔

ذریعہ تعلیم

کمیشن نے قومی زبان اردو کے بارے میں سفارش کی کہ یہ تمام صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی فنی کمزوریاں دُور کر کے اس کے ذخیرہ الفاظ کو وسعت دی جائے اور تیسری سے بارھویں جماعت تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔

ٹیکسٹ بک بورڈ

کمیشن نے سفارش کی کہ درسی کتب کی تیاری، طباعت اور تقسیم کے لیے ایک خود مختار ادارہ ٹیکسٹ بک بورڈ بنایا جائے۔ خلاصے اور گائیڈیں وغیرہ غیر قانونی قرار دی جائیں۔ ان کی اشاعت اور فروخت کو بھی غیر قانونی قرار دیا جائے۔

امتحانی بورڈز

1959ء کی تعلیمی پالیسی کے فیصلہ کے تحت دسویں اور بارھویں جماعتوں کے امتحانات یونیورسٹیوں کی بجائے بورڈوں کے سپرد کیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے نئے امتحانی بورڈز قائم کیے جائیں۔

قومی تعلیمی پالیسی 1970ء

1969ء میں مارشل لاء لگا تو جنرل محمد یحییٰ خاں کی حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ اس نے ایئر مارشل نور خاں کی سربراہی میں تعلیمی تجاویز مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر کیا۔ اس کمیٹی نے پورے ملک سے طلبہ، اساتذہ، سیاسی نمائندوں اور عام لوگوں سے وسیع پیمانے پر رابطے کیے اور نئی تعلیمی پالیسی کے لیے تجاویز مرتب کیں۔ عوامی حلقوں نے اس رپورٹ کا خیر مقدم کیا۔ مارچ 1970ء میں اسمبلی نے نور خاں پالیسی کی منظوری دے دی۔ اس پالیسی کے نمایاں خدوخال درج ذیل ہیں:

ابتدائی تعلیم

اس پالیسی میں تجویز کیا گیا کہ ابتدائی تعلیم پہلی سے آٹھویں جماعت تک شمار کی جائے اور 1980ء تک یہ لازمی کر دی جائے۔ پانچویں درجے تک تعلیم مفت ہوگی۔ کارخانہ داروں کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ اپنے ملازمین کو ضروری تعلیم دیں اور ایران کی سپاہ دانش کی طرز پر ایجوکیشن کور قائم کی جائے۔

علم التعلیم

اساتذہ کی کمی دور کرنے کے لیے سفارش کی گئی کہ انٹر اور ڈگری کی سطح پر "علم التعلیم" کو بطور اختیاری مضمون کے شامل نصاب کیا جائے۔

سائنس کالج اور سائنس سکول

اس پالیسی میں سفارش کی گئی کہ ہر ضلع میں ایک سائنس کالج اور ہر تحصیل میں ایک سائنس سکول قائم کیا جائے۔

قومی زبان

پالیسی میں اردو کے بارے میں سفارش کی گئی کہ اسے قومی زبان قرار دے کر سرکاری زبان بنایا جائے اور درسی کتب اردو میں تیار کی جائیں۔ انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم ختم کرنے کے مسئلہ پر غور وخوض کے لیے ایک کمیشن قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔ نور خاں پالیسی میں انتخابات کے ذریعہ طلبہ یونینیں قائم کرنے کی بھی سفارش کی گئی۔ نور خاں کی تعلیمی پالیسی کئی اعتبار سے ایک جامع اور منفرد پالیسی تھی لیکن اس رپورٹ کے عملی نفاذ کا موقع نہ مل سکا۔

قومی تعلیمی پالیسی 80-1972ء

دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس پالیسی کا اعلان کیا۔ اس پالیسی کے نفاذ کے وقت تمام پرائیویٹ اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا اور ملکی نظام تعلیم کے دوسرے پہلوؤں میں بہت سی تبدیلیاں تجویز کی گئیں۔

لازمی اور مفت تعلیم

پالیسی میں طے کیا گیا کہ ملک کے تمام بچوں کے لیے میٹرک تک عام اور مفت تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا۔ محدود مالی وسائل کے پیش نظر طے کیا گیا کہ اکتوبر 1972ء سے آٹھویں تک اور اکتوبر 1974ء سے دسویں جماعت تک فیس بالکل معاف کر دی جائے گی۔ 1979ء تک تمام لڑکوں اور 1984ء تک تمام لڑکیوں کو لازمی اور مفت تعلیم کی سہولت مہیا کی جائے۔

فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم

کالجوں میں طلبہ کی اکثریت آرٹس میں داخلہ لیتی ہے۔ طے کیا گیا کہ 1980ء تک کالجوں میں فنی اور پیشہ ورانہ مضامین کا اجرا کیا جائے گا۔ پیشوں کے متعلق مضامین میں چالیس فیصد، سائنسی مضامین میں تیس فیصد اور باقی تیس فیصد طلبہ کو آرٹس میں داخل کیا جائے گا۔ جن کالجز میں سائنسی مضامین نہیں پڑھائے جا رہے وہاں سائنس کا اجرا کیا جائے گا۔

پیپلز اوپن یونیورسٹی کا قیام

دوسرے ممالک کی طرح ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے گی جو خط وکتابت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں اور جز وقتی کلاسوں کی سہولتیں مہیا کرے گی۔ اس میں ایسے لوگوں کو تعلیمی سہولیات مہیا کی جائیں گی جو مختلف وجوہات کی بنا پر صبح کی کلاسز میں باقاعدہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ اس یونیورسٹی کا نام اب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن

کتب کا ایک ادارہ ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' قائم کیا جائے گا جو کتابوں کی تصنیف وتالیف اور ترجمہ اور اشاعت کا ذمہ دار ہوگا اور پاکستان پرنٹنگ کارپوریشن کو اس ادارے کا حصہ بنا دیا جائے گا۔

امتحانات

پہلی جماعت سے پانچویں تک سالانہ ترقی، سال بھر کی کارکردگی کی بنیاد پر بغیر امتحان دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ پانچویں سے نویں جماعت تک سالانہ ترقی کا دارومدار سال بھر کی کارکردگی اور سالانہ امتحان پر رکھا گیا۔ دسویں اور بارھویں کے امتحانات بورڈوں کے ذریعے کروانے کا نظام برقرار رکھا گیا۔

تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینا

اس پالیسی کے تحت یکم ستمبر 1972ء سے ملک کے تمام نجی کالج اور یکم اکتوبر 1974ء سے تمام نجی سکول قومی تحویل میں لے لیے گئے۔ ان اداروں کے اساتذہ کو سرکاری اداروں کے برابر تنخواہ اور دوسری مراعات دی گئیں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ نجی اداروں کے مالکان کو کوئی معاوضہ نہ دیا جائے گا۔

فوجی تربیت

طلبہ کو ملکی دفاع کا اہل بنانے کے لیے فوجی تربیت لازمی کر دی گئی۔ اس مقصد کے لیے طلبہ کو مفت یونیفارم اور آئندہ کلاسوں کے داخلوں میں اضافی نمبروں کی سفارش کی گئی۔ طالبات کے لیے بھی یہ تربیت لازمی تھی۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

1959ء کی تعلیمی پالیسی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے قیام کی سفارش کی گئی تھی لیکن 80-1972ء کی پالیسی کے تحت اس کا قیام عمل میں آیا۔ اعلیٰ تعلیم اور یونیورسٹیوں کے تمام معاملات کے فیصلے کرنا اس کمیشن کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اس کمیشن کا موجودہ نام ہائر ایجوکیشن کمیشن ہے۔

80-1972ء کی تعلیمی پالیسی میں تمام بچوں کے لیے یکساں تعلیمی مواقع فراہم کرنے پر زور دیا گیا۔ میٹرک تک مفت تعلیم کا بندوبست کرنے کی کوشش کی گئی۔ نئے امتحانی بورڈ اور یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ طلبہ کو آمدورفت کی سہولت دینے کے لیے کرایوں میں خصوصی رعایت دی گئی۔

80-1972ء کی پالیسی کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ پالیسی بہت اہمیت کی حامل نظر آتی ہے جس نے تعلیم کو جمہوری عمل کا حصہ بنانے کی کوشش کی لیکن مالیاتی مشکلات اور پالیسی کے نفاذ میں جلد بازی اور ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔

قومی تعلیمی پالیسی 1979ء

سابقہ حکومتوں کی طرح 1977ء میں جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھالتے ہی تعلیمی حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کانفرنس بلائی۔ وسیع پیمانے پر تعلیمی اصلاحات کے لیے تجاویز جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا جن کی روشنی میں یہ پالیسی بنائی گئی۔ وزیر تعلیم

جناب محمد خاں ہوتی نے 1979ء میں یہ تعلیمی پالیسی شائع کروائی۔

ہمہ گیر ابتدائی تعلیم

پالیسی کے مطابق 53 فیصد بچے سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جبکہ 47 فیصد بچے اس سے محروم تھے۔ طے کیا گیا کہ سکول میں داخلہ کی عمر تک پہنچنے والے تمام لڑکوں کو 1987ء تک اور تمام لڑکیوں کو 1992ء تک سکولوں میں داخل کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔ اس کے لیے پانچ سالوں میں تیرہ ہزار نئے پرائمری سکول کھولنے کا عزم کیا گیا۔

مساجد سکول

اخراجات بچانے، مساجد اور ان کے عملے سے فائدہ اٹھانے کے لیے پالیسی میں طے کیا گیا کہ مساجد سکول شروع کیے جائیں جن میں قرآن حکیم اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیم کے دوسرے مضامین شامل کر لیے جائیں۔ امام مسجد کی مدد کے لیے ایک تربیت یافتہ استاد کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ ابتدا میں پانچ ہزار مساجد سکول کھولنے کا پروگرام بنایا گیا۔

محلہ سکول

اسلامی معاشرے میں کچھ پڑھی لکھی خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی حیاداری اور دوسری وجوہات کی بنا پر اپنے گھر کے ماحول سے باہر نکل کر کام کرنا پسند نہیں کرتیں۔ خواتین نے اپنے گھروں پر ہی صبح یا شام کے اوقات میں محلہ کی بچیوں کو قرآن مجید پڑھانے اور سلائی کڑھائی وغیرہ کی تربیت دینے کا کام جاری کیا ہوا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی میں تعلیمی و تربیتی مرکزوں کی اس نظرانداز شدہ قسم سے فائدہ اٹھانے کے لیے تربیت یافتہ خواتین کے ذریعہ چلانے کا پروگرام بنایا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ایسے اداروں کی معلمات کو اعزازی تنخواہیں دی جائیں اور طالبات کے لیے مفت درسی کتب اور تدریسی اعانتوں کا انتظام کیا جائے۔ ان اداروں کے نصاب میں گھریلو اقتصادیات کو بھی شامل کیا جائے اور یہاں بڑی عمر کی خواتین کو تعلیم و تربیت دی جائے۔

دیہی ورکشاپ سکول

تعلیم حاصل نہ کرنے والے اور تعلیم مکمل کرنے سے پہلے سکول چھوڑ دینے والے بچوں کی تربیت کا ملک میں کوئی انتظام نہیں تھا ایسے بچوں کو حصول معاش کے قابل بنانے کے لیے ایک ہزار دیہی ورکشاپ سکول کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے ورکشاپ سکولوں میں تربیت یافتہ عملہ مقرر کرنے کے علاوہ پیشہ ورانہ لوگوں سے مدد لینے کا پروگرام بنایا گیا۔

خصوصی بچوں کی تعلیم

خصوصی بچوں اور معذور افراد کے بارے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کی آبادی چار فیصد کے قریب ہے۔ جسمانی طور پر معذور، گونگے اور بہرے، ذہنی طور پر پس ماندہ اور نابینا افراد کے لیے پالیسی میں طے کیا گیا کہ مرکزی حکومت ایسے افراد کی تربیت اور بحالی کے لیے رہنما منصوبے بنائے گی۔ ایسے لوگوں کو مفید مہارتیں سکھائی جائیں گی تا کہ یہ معاشی طور پر خود کفیل ہو جائیں۔ ایسے ادارے چلانے والی تنظیموں کی بھی مدد کی جائے گی۔ حکومتی سطح پر تعلیمی پالیسی میں پہلی دفعہ ایسے لوگوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی۔

اسلامی مدارس

دارالعلوم، مکاتب اور مدارس کا نظام مسلمانوں میں اسلام کی اشاعت اور قرآن کی تعلیم کے لیے قائم ہے۔ یہ ادارے مفت تعلیم

کا بندوبست کرتے ہیں۔ان اداروں کی طرف حکومت نے کبھی توجہ نہیں کی۔ان اداروں کے بورڈوں کے ساتھ الحاق کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ان اداروں کے فارغ التحصیل لوگوں کو سرکاری ملازمتیں دی جانے لگیں۔

اسلامیات اور مطالعہ پاکستان

اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کی تدریس لازمی کر دی گئی۔ یہاں تک کہ اسے پیشہ ورانہ کالجوں کے نصاب میں بھی شامل کر دیا گیا۔

نجی اداروں کے قیام کی اجازت

1972-80ء کی تعلیمی پالیسی میں نجی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔اس پالیسی میں دوبارہ نجی اداروں کے قیام کی اجازت دی گئی۔

یونیفارم

طے کیا گیا کہ 80-1979 سے تمام سکولوں میں ایک جیسا یونیفارم لازمی ہوگا۔لڑکوں کے لیے طے کیا گیا کہ وہ ملیشیا کی شلوار قمیض پہنیں گے۔لڑکیاں ہلکے نیلے رنگ کی قمیض اور سفید شلوار استعمال کریں گی۔ دوپٹے کا رنگ ادارے کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جاسکے گا۔موسم سرما میں بھی اضافی کپڑوں کے ساتھ یہی لباس استعمال کیا جائے گا۔

ذریعہ تعلیم

پاکستان کے آئین اور قائداعظمؒ کے فرمان کے مطابق اردو کی حیثیت مسلّم ہے۔پالیسی میں طے کیا گیا کہ پندرہ سال کے اندر اردو کو دفتری زبان کے طور پر نافذ کر دیا جائے گا۔لیکن عبوری عرصے میں انگریزی کو دفتری کاروبار چلانے کے لیے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔یہ بھی طے کر دیا گیا کہ حکومت سے امداد حاصل کرنے والے تمام انگلش میڈیم سکول قومی زبان اردو یا صوبائی اسمبلی سے منظور شدہ علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائیں گے۔اعلیٰ تعلیم کے درجوں میں بھی اردو کو بتدریج ذریعہ تعلیم بنایا جائے گا۔

اس پالیسی میں عوام میں یکجہتی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریہ حیات کی روشنی میں فرد کی تعلیم وتربیت کا نظام قائم کرنے کی خواہش موجود ہے لیکن اس پالیسی کا حشر بھی دوسری تعلیمی پالیسیوں سے مختلف نہیں ہے۔ بعد میں آنے والوں نے اپنی نئی تعلیمی پالیسیاں بنائیں اور نافذ کیں۔پانچویں پانچ سالہ منصوبے 83-1978ء میں تعلیم پر اٹھنے والے اخراجات کی شرح قومی پیداوار کے 1.8 سے بڑھا کر 3.1 کرنے کا پروگرام بنایا گیا مگر اس پر بھی عمل نہ ہوا۔

قومی تعلیمی پالیسی 1992ء

نومبر 1988ء کے انتخابات کے نتیجے میں پاکستان پیپلز پارٹی ایک دفعہ پھر برسراقتدار آئی۔ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے اپنی تعلیمی پالیسی وضع کرنے کے لیے ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی ایک کانفرنس 1990 میں طلب کی۔اس کانفرنس میں اصلاحات کے لیے بہت سی تجاویز سامنے آئیں۔ابھی نئی تعلیمی پالیسی تیاری کے مراحل میں تھی کہ اکتوبر 1990 کے انتخابات کے نتیجے میں میاں نواز شریف کی سربراہی میں مسلم لیگ کی حکومت برسراقتدار آئی۔اس وقت کے وزیر تعلیم جناب سید فخر امام نے 1992ء میں نئی قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا جس کے اہم اہداف ذیل میں دیے جارہے ہیں۔

پرائمری تعلیم

اس سے پہلے کی تمام پالیسیوں میں پہلی سے آٹھویں جماعت تک کی ابتدائی تعلیم کو لازمی کرنے کا عندیہ دیا گیا لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر پہلی سے پانچویں جماعت تک کی پرائمری تعلیم کو جاری رکھا گیا۔ اس پالیسی میں کہا گیا کہ خواندگی کی موجودہ شرح 31 فیصد سے بڑھا کر 2002ء تک 70 فیصد کردی جائے گی۔ پرائمری میں آہستہ آہستہ داخلے کی شرح 100 فیصد تک بڑھادی جائے گی۔ حکومت کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ داخلے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی پرائمری سکول کھول سکے اس لیے سات ہزار کے قریب مسجد سکول کھولے جائیں گے۔

کمپیوٹر کی تعلیم

کمپیوٹر موجودہ دور کی انتہائی اہم ایجاد ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں کمپیوٹر سے فائدہ نہ اٹھایا جا رہا ہو۔ کمپیوٹر کی تعلیم کی اہمیت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ آئندہ قومی ضروریات پوری کرنے کے لیے طلبہ کو اس کی تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ اس لیے طے کیا گیا کہ سکول کی سطح پر کمپیوٹر کی تعلیم کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

فروغ تعلیم کے لیے پروگرام

اس پالیسی میں فروغ تعلیم کے خاصے پروگرام شامل کیے گئے۔ 33 نئے پولی ٹیکنیک ادارے، 8 نئے ٹیکنالوجی کالجز قائم کرنے کا عزم کیا گیا۔ اسی طرح سیکنڈری سکولوں کی تعداد انیس ہزار سے بڑھا کر 48487 کالجوں کی تعداد 535 سے بڑھا کر 935 اور یونیورسٹیوں کی تعداد 23 سے بڑھا کر 43 کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ان بیس نئی یونیورسٹیوں میں سے 16 نجی شعبے قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس طرح نجی شعبے کو تعلیمی پروگراموں میں شریک کرنے کے لیے کئی اور اقدامات بھی تجویز کیے گئے۔

اخراجات

پالیسی میں بتایا گیا کہ آئندہ دس برس میں تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کے لیے 143 ارب روپے کے ترقیاتی اخراجات ہوں گے جن میں سے 36 ارب نجی شعبے میں ہوں گے۔

امتحانات

امتحانات کو بدعنوانیوں سے پاک کرکے اس کی اصلاح کا پروگرام بنایا گیا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ بورڈوں اور یونیورسٹیوں میں پورے امتحانی نظام کو کمپیوٹر سے منسلک کردیا جائے گا۔ پرچہ سوالات میں سابقہ دور کے معروضی حصہ کو بڑھایا اور انشائیہ حصہ کو بہت مختصر کردیا جائے گا۔ امتحانات کے معیار کو بہتر بنا کر ترقی یافتہ ممالک کے برابر لایا جائے گا۔

آٹھویں پانچ سالہ منصوبے 98-1993 میں پانچ سے نو سال کے تمام بچوں کو پرائمری تعلیم دلوانے، اساتذہ کی تربیت اور شرح خواندگی میں اضافے کا پروگرام بنایا گیا مگر اس پر بھی مکمل طور پر عمل نہ ہوسکا۔

قومی تعلیمی پالیسی 2010-1998ء

مسلم لیگ کی حکومت 1997ء میں پھر برسر اقتدار آئی تو وزیر اعظم نواز شریف نے نئی تعلیمی پالیسی تشکیل دینے کا حکم دیا جس کا اعلان اس وقت کے وزیر تعلیم سید غوث علی شاہ نے مارچ 1998ء میں کیا۔ اس پالیسی کے نمایاں خدوخال درج ذیل ہیں:

اسلامک ایجوکیشن

قرارداد مقاصد اور آئین پاکستان کی دفعہ 13 کے مطابق پہلی دفعہ یہ تسلیم کیا گیا کہ پاکستانی شہری کے لیے قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرنے کی جو ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، طلبہ کی اس کے مطابق تربیت کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قرآن کی تعلیم کو تمام سطحوں اور درجوں میں لازمی قرار دیا گیا۔ چھٹی سے بارھویں جماعت تک قرآن پاک مع ترجمہ پڑھانے کا پروگرام بنایا گیا۔ اسلامی تعلیمات کے تربیتی پروگرام پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج، نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، سٹاف کالجز اور آرمڈ فورسز کی اکیڈمیز میں بھی شروع کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ طے کیا گیا کہ دینی مدارس کو جدید سکولوں کی طرز پر ڈھال کر دینی مدارس کے جاری کردہ سرٹیفیکیٹس اور ڈگریوں کو تسلیم کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے منظوری دینے کا اہتمام کیا جائے گا۔

ابتدائی تعلیم

یہ بات بین الاقوامی سطح پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ تعلیم حاصل کرنا ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ موجودہ پالیسی میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر شہری کو تعلیم کے مواقع مہیا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس وقت 71 فیصد بچے سکول میں داخل ہوتے ہیں جن میں سے 45 فیصد پرائمری سکول کے دوران سکول چھوڑ جاتے ہیں۔ 2002ء تک داخلوں کی شرح 90% کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اساتذہ کی تربیت اور موجودہ نظام کی خرابیاں دور کرنے کے لیے خصوصی پروگرام بنائے گئے۔

مسجد سکول

ایلیمنٹری ایجوکیشن کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے پینتالیس ہزار نئے سکول کھولنے کا پروگرام بنایا گیا جن میں سے بیس ہزار سکول مساجد میں کھولنے کا منصوبہ تھا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ لازمی اور مفت ایلیمنٹری سکول ایجوکیشن کا ایکٹ جلد اسمبلی میں پیش کیا جائے۔ خواندگی میں اضافہ کے لیے بیاسی ہزار، غیر رسمی سکول کھولنے کا منصوبہ بنایا گیا۔

ضابطۂ اخلاق

اس تعلیمی پالیسی میں پہلی بار ضرورت محسوس کی گئی کہ اساتذہ کے لیے ایک ضابطہ اخلاق تشکیل دیا جائے اور تعلیمی بہتری کے لیے اسے نافذ کیا جائے۔

اعلیٰ تعلیم

تجویز کیا گیا کہ 17 سے 23 سال کی عمر کے کم از کم 7 فیصد نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع مہیا کیے جائیں۔ اس پالیسی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سائنس اور آرٹس دونوں میں برابر شرح سے داخلہ دینے کا پروگرام بنایا گیا۔ سفارش کی گئی کہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع میں اضافہ کیا جائے۔ یونیورسٹیوں کو مزید کیمپس کھولنے کی سہولیات دی جائیں۔ داخلے میرٹ پر کیے جائیں۔ ڈگری کی سطح کی تعلیم کو

بین الاقوامی معیار کے مطابق بنایا جائے۔ اچھی شہرت کے حامل کالجز کو ڈگری جاری کرنے اور نصابات بنانے جیسے معاملات میں خودمختاری دے دی جائے۔ یونیورسٹی اساتذہ کو عام گریڈ سے زیادہ شرح پر تنخواہیں دی جائیں۔ تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے بجٹ کی شرح بڑھا کر جی ڈی پی کا 4 فیصد کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔

پاکستان میں تعلیمی پالیسیوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ 1947ء سے اب تک جتنی حکومتیں تبدیل ہوئیں سب نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کو ضروری سمجھا جب کہ سب پالیسیوں کے مقاصد میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی پالیسی قومی پالیسی ہوتی ہے اور اسے حکومت بدلنے کے ساتھ تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔ تعلیمی پالیسی کے مقاصد کے حصول کے لیے لمبی مدت کی سرمایہ کاری بہت ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں تعلیمی پالیسیوں کے مقاصد کے حصول کے لیے اچھے ترقیاتی منصوبے بھی بنائے گئے لیکن ان منصوبوں پر عمل درآمد نہ کیا گیا۔ اس لیے آج تک تعلیمی مقاصد کا حصول ممکن نہیں ہوا۔

اہم نکات

1- تمام تعلیمی پالیسیوں میں پاکستان کی نظریاتی اساس اور خواندگی کے حصول کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

2- تعلیمی کانفرنس 1947ء پاکستان میں بننے والی تمام تعلیمی پالیسیوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہی ہے۔

3- تعلیمی کمیشن رپورٹ 1959ء میں پہلی بار نظام امتحانات کو تبدیل کیا گیا اور تین سالہ ڈگری پروگرام تجویز کیا گیا مگر عوامی احتجاج پر اسے واپس لینا پڑا۔

4- یحییٰ خاں کے دور میں بننے والی 1970ء کی تعلیمی پالیسی عوام کی امنگوں کے مطابق ہونے کے باوجود عمل درآمد سے محروم رہی۔

5- 1972-80ء کی تعلیمی پالیسی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک انقلابی پالیسی تھی۔ اس پالیسی کے تحت انگلش میڈیم اداروں کے علاوہ نجی شعبہ کے تمام سکول و کالج قومی تحویل میں لیے گئے۔ لیکن اس پر بھی جزوی طور پر عمل کیا گیا۔ فیسوں میں معافی اور تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینے کی وجہ سے اخراجات اتنے بڑھ گئے کہ حکومت اپنے منصوبوں پر عمل نہ کر سکی۔

6- 1979ء کی تعلیمی پالیسی ضیاء الحق (مرحوم) نے بنوائی اس میں تعلیم کے فنی اور نظریاتی پہلوؤں پر بہت زور دیا گیا۔ مسجد سکول، ورکشاپ سکول اور محلہ سکول کھولنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اردو کو پندرہ سال میں قومی زبان کے طور پر نافذ کرنے کا پروگرام بھی بنا، لیکن ایسا نہ کیا جا سکا۔ البتہ نجی شعبہ کو دوبارہ تعلیمی ادارے کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔

7- 1992ء کی تعلیمی پالیسی کا اعلان نواز شریف کے دور میں ہوا۔ تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے ایک سال کے اندر اندر اس کی حکومت تبدیل ہو گئی۔

8- 1998-2010ء کی تعلیمی پالیسی نواز شریف کے دوسرے دور میں تیار ہونے کے بعد نافذ کر دی گئی۔

آزمائشی مشق

معروضی حصہ

-I چار ممکنہ جوابات میں سے درست جواب کی نشاندہی کریں:

-i مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ اس لیے کیا کہ:

ا۔ وہ ایک الگ اور مستقل قوم تھے۔
ب۔ ہندو غیر منقسم ہندوستان میں اکثریت میں تھے۔
ج۔ انگریز مسلمانوں کو غلام رکھنا چاہتے تھے۔
د۔ مسلمان اپنے نظریہ حیات کا تحفظ چاہتے تھے۔

-ii پہلی دفعہ کمپیوٹر کی تعلیم کو سکولوں میں متعارف کرانے کی سفارش کی گئی:

ا۔ تعلیمی پالیسی 80-1972
ب۔ تعلیمی کمیشن 1959
ج۔ تعلیمی پالیسی 1992
د۔ تعلیمی پالیسی 2010-1998

-iii 80-1972 کی تعلیمی پالیسی میں:

ا۔ اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کی تعلیم لازمی کردی گئی۔
ب۔ کمپیوٹر کی تعلیم لازمی کردی گئی۔
ج۔ نجی اداروں کو قومی تحویل میں لیا گیا۔
د۔ ورکشاپ سکول کھولے گئے۔

-iv 1970 کی تعلیمی پالیسی نافذ نہ ہوسکی:

ا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے
ب۔ عوام کی مخالفت کی وجہ سے
ج۔ تعلیمی اداروں کے عدم تعاون کی وجہ سے
د۔ حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے

-v بی اے کی ڈگری کے پروگرام کا دورانیہ دو سے بڑھا کر تین سال کر دیا گیا:

ا۔ تعلیمی پالیسی 1947ء
ب۔ تعلیمی پالیسی 1970ء
ج۔ تعلیمی کمیشن 1959ء
د۔ تعلیمی پالیسی 1979ء

-vi تعلیمی پالیسی 1970ء کے دور میں وضع کی گئی:

ا۔ میاں نواز شریف کے
ب۔ ذوالفقار علی بھٹو کے
ج۔ جنرل یحییٰ خان کے
د۔ جنرل ضیاالحق کے

-vii پہلی تعلیمی کانفرنس کا اولین مقصد تھا:

ا۔ تعلیم بالغاں کی طرف توجہ دینا
ب۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے لیے تیاری
ج۔ نظام تعلیم کو اپنی ثقافت کے مطابق ڈھالنا
د۔ ایثار، قربانی اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا

viii- ٹیکسٹ بک بورڈ کے قیام کا مقصد ہے:

ا۔ امتحان کے لیے تیاری | ب۔ ڈگریوں کی تقسیم

ج۔ درسی کتب کی تیاری اور طباعت | د۔ خلاصے اور گائیڈوں کی تیاری

ix- 1970ء کی تعلیمی پالیسی میں انٹر اور ڈگری کی سطح پر اختیاری مضمون کے طور پر شامل کرنے کی سفارش کی گئی:

ا۔ فنی تعلیم | ب۔ زرعی تعلیم

ج۔ علم التعلیم | د۔ جسمانی تعلیم

x- طلبہ کے لیے فوجی تربیت لازم کردی گئی:

ا۔ تعلیمی پالیسی 1947ء کے تحت | ب۔ تعلیمی پالیسی 1979ء کے تحت

ج۔ تعلیمی پالیسی 1970ء کے تحت | د۔ تعلیمی کمیشن 1959ء کے تحت

II- مندرجہ ذیل بیانات میں سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ غلط۔ اگر بیان صحیح ہو تو "ص" کے گرد اور غلط ہو تو "غ" کے گرد دائرہ لگائیں:

i- عمل تعلیم اور تعلیمی نظام کو قومی نظریہ حیات سے جدا کیا جاسکتا ہے۔ ص / غ

ii- قومی تعلیمی کمیشن 1959ء میں انٹرمیڈیٹ کلاسوں کو یونیورسٹی تعلیم سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ص / غ

iii- اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ ص / غ

iv- تعلیمی پالیسی قومی پالیسی ہوتی ہے، اسے حکومت بدلنے کے ساتھ تبدیل ہونا چاہیے۔ ص / غ

v- پاکستان میں تعلیمی پالیسیوں کے مقاصد کے حصول کے لیے کامیاب ترقیاتی منصوبے بنائے گئے۔ ص / غ

vi- قومی تعلیمی پالیسی 2010-1998ء میں پرائمری سکولوں میں داخلے کی شرح 90 فی صد تک کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ص / غ

vii- 1979ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں اساتذہ کے لیے ضابطہ اخلاق تشکیل دینے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ ص / غ

viii- ایران کی سپاہ دانش کی طرز پر ایجوکیشن کور قائم کرنے کا پروگرام قومی تعلیمی پالیسی 1970ء کے تحت بنایا گیا۔ ص / غ

xi- اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے تربیت یافتہ افرادی قوت مہیا کرنا تعلیم کا بنیادی فریضہ ہے۔ ص / غ

x- ہائر ایجوکیشن کمیشن کے دائرہ اختیار میں اعلیٰ تعلیم اور یونیورسٹیوں کے تمام معاملات کے فیصلے کرنا شامل ہے۔ ص / غ

III- مندرجہ ذیل خالی جگہ پُر کریں:

i- ہر ملک اپنی تعلیمی پالیسی کے مقاصد اپنے نظریہ .... کے مطابق طے کرتا ہے۔

ii- برطانوی نظام تعلیم نے ایک غلامانہ .... کو جنم دیا۔

iii- 1947ء کی تعلیمی کانفرنس کے نام اپنے پیغام میں .... نے فرمایا "نئی مملکت کا قیام ہی ہمارا مقصد نہ تھا بلکہ یہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے"۔

-iv علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی تعلیمی پالیسی .... کے تحت قائم ہوئی۔

-v 1972-80ء کی تعلیمی پالیسی کے تحت .... تک مفت تعلیم کے احکامات جاری کیے گئے۔

-vi تعلیمی پالیسی کے .... کے حصول کے لیے لمبی مدت کی سرمایہ کاری بہت ضروری ہے۔

-vii یہ بات بین الاقوامی طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ تعلیم حاصل کرنا ہر شہری کا بنیادی .... ہے۔

-viii 1979ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں طے کیا گیا ہے پندرہ سال کے اندر .... کو دفتری زبان کے طور پر نافذ کر دیا جائے گا۔

-xi پہلی تعلیمی کانفرنس 27 نومبر 1947ء کو .... میں منعقد ہوئی۔

-x مساجد سکول قومی تعلیمی پالیسی .... کے تحت قائم ہوئے۔

-IV کالم (ا) کو کالم (ب) سے ملا کر صحیح جواب کالم (ج) میں لکھیے:

	کالم (ا)	کالم (ب)	کالم (ج)
-i	انگریزی کو ناگزیر برائی کے طور پر کچھ عرصہ جاری رکھنے کی سفارش کی گئی	تعلیمی پالیسی 1972-80ء	
-ii	تعلیمی کانفرنس 1947ء سے خطاب کیا	تعلیمی پالیسی 1979ء	
-iii	میٹرک تک تعلیم مفت کرنے کے احکامات جاری کیے	تعلیمی کمیشن 1959ء	
-iv	ایک انقلابی تعلیمی پالیسی ہے	تعلیمی پالیسی 1970ء	
-v	مسجد سکول کھولے گئے	تعلیمی کانفرنس 1947ء	
-vi	بی اے کا دورانیہ تین سال کر دیا گیا	نور خاں کمیشن	
-vii	چھٹی سے بارھویں جماعت تک قرآن پاک مع ترجمہ پڑھانے کا پروگرام بنایا گیا	میاں نواز شریف	
-viii	کمپیوٹر کی تعلیم متعارف کرانے کی پہلی دفعہ سفارش کی گئی	تعلیمی پالیسی 1992ء	
-ix	دو مختلف تعلیمی پالیسیاں بنانے کے احکامات جاری کیے	قومی تعلیمی پالیسی 1970ء	
-x		ذوالفقار علی بھٹو	
-xi		قائداعظم محمد علی جناحؒ	

-V مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کیجیے جو چار سطروں سے زیادہ نہ ہوں:

-i 1947ء کی تعلیمی کانفرنس کے نام قائداعظمؒ کے پیغام کے چار اہم نکات لکھیے۔

-ii تعلیمی کمیشن 1959 کے مجوزہ نظام امتحانات کے فوائد پر ایک نوٹ لکھیے۔

-iii درج ذیل پر نوٹ لکھیے:

ا۔ مساجد سکول ب۔ محلہ سکول ج۔ دیہی ورکشاپ سکول

iv- ابتدائی تعلیم کی اہمیت کے پیشِ نظر 1970ء تعلیمی پالیسی میں کیا اہم سفارشات پیش کی گئیں؟
v- 80-1972ء کی تعلیمی پالیسی میں میٹرک تک تعلیم مفت کر دی گئی۔ اس کے چار فوائد لکھیے۔
vi- 1979ء کی پالیسی میں کیا نقائص تھے چار سطروں میں لکھیے۔
vii- علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے قیام کی وجوہات لکھیے۔
viii- ہائر ایجوکیشن کمیشن کے قیام پر نوٹ لکھیے۔
xi- 1979ء کی تعلیمی پالیسی میں پاکستان کے لیے اردو کی اہمیت کے پیشِ نظر کیا سفارشات پیش کی گئیں؟
x- 1992ء کی تعلیمی پالیسی میں شرح خواندگی بڑھانے کے لیے جو اقدامات تجویز کیے گئے ان میں سے چار کا ذکر کریں۔

انشائیہ حصہ

VI- تعلیمی پالیسیوں کے حوالہ سے تعلیمی مقاصد کی اہمیت بیان کیجیے۔
VII- 1959ء کی کمیشن رپورٹ ایک جامع تعلیمی پالیسی تھی، واضح کیجیے۔
VIII- 80-1972ء کی تعلیمی پالیسی کے منفی اور مثبت اثرات بیان کیجیے۔
IX- قومی تعلیمی کمیشن 1959ء اور 80-1972ء کی تعلیمی پالیسی کی اہم سفارشات کا تقابلی جائزہ لیجیے۔
X- تعلیمی پالیسی 1979ء کی اہم سفارشات کا جائزہ لیجیے۔
XI- نظریہ پاکستان کے تعلیمی تقاضوں کے تعلیمی پالیسیوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے واضح کیجیے۔
XII- تعلیمی پالیسی 1992ء اور تعلیمی پالیسی 1979ء کی اہم سفارشات کا موازنہ کیجیے۔
XIII- تعلیمی پالیسی 1992ء کی اہم سفارشات کی اہمیت واضح کیجیے۔
XIV- ابتدائی تعلیم کے بارے میں مختلف تعلیمی پالیسیوں کا جائزہ پیش کیجیے۔
XV- تعلیمی پالیسی کے مقاصد کا حصول کیسے ممکن بنایا جا سکتا ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

پاکستان کے تعلیمی مسائل

(Educational Problems in Pakistan)

قوموں کی برادری میں ہمیشہ سے صرف انھیں معاشروں اور قوموں کو برتری حاصل رہی ہے جو تعلیم کے میدان میں سب سے آگے رہے ہیں۔ تعلیمی ترقی قومی ترقی کی ضمانت ہے۔ یہ اصول آج بھی پہلے دن کی طرح درست ہے۔ آج انھیں ممالک اور قوموں کو عروج حاصل ہے جو تعلیمی لحاظ سے آگے ہیں اور جنھوں نے تعلیم کو دیگر معاملات زندگی پر ترجیح دی ہے۔ آج تک ہم پاکستان میں پچھلی نصف صدی سے زائد عرصے میں اپنے تعلیمی مسائل پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوسکے بلکہ بعض نئے مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ابھی تک پاکستان کا شمار تعلیمی لحاظ سے ترقی یافتہ اقوام میں نہیں کیا جاتا۔ یہ تعلیمی مسائل اس قدر پیچیدہ اور زیادہ ہیں کہ اس باب میں ان تمام کا احاطہ ممکن نہیں۔ اس لیے اگلے صفحات میں بعض اہم اور نمایاں تعلیمی مسائل کا بیان کیا جائے گا۔

ناخواندگی

کسی قوم یا ملک کی ترقی کے لیے اس کے افراد کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ تعلیم یافتہ افراد نہ صرف اپنا معیار زندگی بہتر بناتے ہیں بلکہ ملک وقوم کو بہتر افرادی قوت بھی مہیا کرتے ہیں اور ملک کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

خواندگی کے لغوی معنی کسی تحریر یا عبارت کو پڑھنے کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً کسی بھی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت خواندگی کہلاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں وہ افراد خواندہ کہلاتے ہیں جو پانچویں جماعت کے پاس شدہ طالب علم کی سطح کے مطابق ہوں۔

پاکستان میں 1981ء کی مردم شماری کے مطابق کسی زبان میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا، خط لکھنا اور روزمرہ زندگی میں معمولی حساب کرلینا خواندگی کہلاتا ہے۔

یونیسکو کے مطابق کسی زبان میں سمجھ بوجھ کر کم ازکم ایک پیراگراف پڑھنا، لکھنا اور بیان کرنا خواندگی کہلاتا ہے۔ پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن کی شرح خواندگی بہت کم ہے۔ کم شرح خواندگی کے باعث ملک کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی ترقی میں رکاوٹیں آرہی ہیں۔ 2003ء کے اعداد وشمار کے مطابق پاکستان کی آبادی کا 51.6 فی صد حصہ خواندہ ہے۔ مردوں کی شرح خواندگی 62.8 فیصد جب کہ عورتوں میں خواندگی کی شرح 40.2 فی صد ہے یعنی ہر دو مردوں میں سے ایک ناخواندہ اور ہر تین عورتوں میں سے دو ناخواندہ ہیں۔ خواندگی کی صورت حال میں دیہی اور شہری آبادی میں اور بھی نمایاں فرق موجود ہے۔ شہری آبادی کا 69 فی صد اور دیہی آبادی کا 41 فی صد حصہ خواندہ ہے۔ دیہات میں خواتین کی شرح خواندگی 27 فی صد ہے یعنی چار دیہی خواتین میں سے تین ناخواندہ ہیں۔

اقتصادی لحاظ سے پاکستان کا شمار ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے لیکن خواندگی کے اعتبار سے ہمارے ملک کی صورت حال بہت زیادہ بہتر نہیں۔ ہمسایہ ممالک بھارت، چین، سری لنکا وغیرہ ہم سے بہت آگے ہیں۔ درج ذیل چارٹ سے ان ممالک کی شرح خواندگی کا موازنہ کیا جاسکتا ہے:۔

نمبر شمار	نام ملک	شرح خواندگی	نمبر شمار	نام ملک	شرح خواندگی
1-	بھوٹان	54	7-	ایران	92.9
2-	بنگلہ دیش	65	8-	ملائشیا	85.6
3-	پاکستان	60.0	9-	سری لنکا	92.0
4-	بھارت	57.0	10-	جنوبی کوریا	98.9
5-	چین	84.3	11-	آسٹریلیا	99.5
6-	نیپال	51.0	12-	مالدیپ	98.9

پاکستان میں ناخواندگی کی وجوہات

1- آبادی میں اضافہ

پاکستان میں ناخواندگی کی سب سے بڑی وجہ آبادی میں تیز رفتاری سے ہونے والا اضافہ ہے۔ ملک میں شرح خواندگی میں تقریباً 1 فیصد سالانہ اضافہ ہوتا ہے جبکہ آبادی کی شرح اضافہ 2 فیصد کے قریب ہے۔ آبادی کے بڑھنے سے اقتصادی اور معاشرتی وسائل پر دباؤ بڑھتا ہے جس کی وجہ سے پوری آبادی کے لیے تعلیمی سہولتیں فراہم نہیں ہوسکتیں۔ پاکستان میں اس وقت بھی 5 سے 9 سال کی عمر کے تقریباً 54 لاکھ بچے سکول میں داخلہ نہیں لے سکے۔

2- سکولوں کی کمی

ملک میں تعلیم حاصل کرنے والے عمر کے بچوں کی تعداد کی مناسبت سے تعلیمی اداروں کی کمی ہے۔ اگرچہ اب سرکاری اور نجی سطح پر تعلیمی ادارے کھولے جا رہے ہیں لیکن دیہی علاقوں میں خصوصاً ابھی تک تمام بچوں کے لیے تعلیمی ادارے موجود نہیں ہیں۔

3- ترک مدرسہ

اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دینے والے بے شمار بچے ناخواندہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستان میں پرائمری سطح پر ترک مدرسہ کی شرح 50 فیصد کے قریب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں ہر سال اتنی ہی تعداد میں ناخواندہ افراد کا اضافہ ہو رہا ہے جو خواندگی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

4- غربت

سماجی اور معاشی لحاظ سے ملک میں غریب طبقہ عددی لحاظ سے سب سے بڑا ہے جو اپنی قلیل اور محدود آمدنی کے باعث اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کی بجائے کہیں نہ کہیں کام پر لگانے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ تعلیم کو اپنی بنیادی ضرورت تصور نہیں کرتے وہ تعلیم کو سرمایہ کاری کی بجائے اسراف سمجھتے ہیں اس لیے تعلیم کی طرف اُن کا رویہ عموماً منفی ہوتا ہے۔ اس طرح غربت ناخواندگی میں اضافے کا اہم سبب ہے۔

5- تعلیم بالغاں کی کمی

پاکستان میں بالغوں کی تعلیم کے لیے بہت سے منصوبے بنائے گئے لیکن سماجی اور اقتصادی مسائل کی وجہ سے ان پر پوری طرح

عمل نہ ہو سکا۔ اس طرح تعلیمی اداروں میں داخلہ نہ لینے یا ترکِ مدرسہ کے سبب سکولوں سے باہر رہ جانے والے بچے بالغ ہو کر بھی ناخواندگی کا شکار رہتے ہیں۔

تعلیم نسواں

دنیا کے تمام قدیم اور جدید معاشروں کی ترقی میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ برابر شریک رہی ہیں۔ ان کے بغیر معاشرے کا وجود ممکن نہیں۔ یوں بھی آبادی کا تقریباً نصف حصہ عموماً خواتین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی متوازن شرکت کے بغیر کسی بھی معاشرے میں ترقی کا عمل مطلوبہ رفتار سے جاری نہیں رہ سکتا جو صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ علم حاصل کرنا جتنا مرد کے لیے ضروری ہے اتنا ہی عورت کے لیے بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے کسی تفریق کے بغیر تعلیم کو عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں طور پر فرض قرار دیا ہے۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت کا ہونا بھی اسی وجہ سے ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت میں ماں کا کردار باپ کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ ماں آنے والی نسلوں کی تربیت کرتی ہے اور ہماری نسلوں کی اچھی تربیت اسی وقت ممکن ہے جب ہماری مائیں پڑھی لکھی ہوں گی۔ ماں کی گود بچے کی تعلیم کا ابتدائی گہوارہ ہوتی ہے۔ ہر بچہ اپنی ماں کی گود سے ہی اپنے اردگرد کے ماحول اور دنیا کے بارے میں جاننے کا آغاز کرتا ہے۔ کیا اچھا ہے اور کیا برا، کس بات میں فائدہ ہے اور کس میں نقصان۔ باہمی رشتوں اور تعلقات کی نوعیت اس کی عادات، رویے اور اقدار ماں کی تعلیم و تربیت سے ہی جنم لیتے ہیں۔

ماں کے کردار کے علاوہ بھی خواتین معاشرے کی ترقی میں مختلف کردار ادا کرتی ہیں۔ عورتوں کے مسائل کو مردوں کی نسبت ایک تعلیم یافتہ عورت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ زندگی کے بہت سے شعبوں میں خواتین بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ خواتین ہمدرد ڈاکٹر یا نرس، قابل معلمہ، اچھی میزبان، امورِ خانہ داری کی ماہر، ذمہ دار پولیس آفیسر اور حساس وکیل کے طور پر معاشرے کی ترقی میں مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ بلکہ مقامی، صوبائی اور مرکزی سطح پر سیاست میں حصہ لے کر معاشرے کو بہتر بنانے میں اہم ذمہ داریاں بھی پوری کر رہی ہیں۔

انسان کی تمدنی زندگی میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تخلیق، تربیت اور پرورش اس کی فطرت کے اہم حصے ہیں۔ عورت کے یہ جوہر معاشرے کی ترقی کی بنیاد ہیں۔ وہ معاشرے کی فلاح و بہبود اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اقوام متحدہ کے چارٹر میں عورتوں اور مردوں کے حقوق یکساں ہیں۔ تعلیم، صحت، روزگار کی بنیادی سہولتیں مردوں کی طرح عورتوں کا بھی بنیادی حق ہیں۔ انہیں اظہار رائے اور اپنے متعلق فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ مکمل فرد کی حیثیت سے معاشرتی اور معاشی معاملات میں برابر کی حصہ دار ہیں۔

علاقائی اور قبائلی ثقافت اور رسم و رواج نے تعلیم نسواں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کے شعبے میں صنفی عدم مساوات کے باعث عورتوں اور مردوں کی شرح خواندگی میں فرق ہے۔ لڑکیوں کے لیے تعلیمی ادارے ملکی اداروں کی کل تعداد کے 30 فی صد سے بھی کم ہیں۔

کسی بھی معاشرے کے نصف حصے کے معاشرتی اور معاشی ترقی سے الگ رہنے سے مکمل ترقی کا تصور ناممکن ہے۔ پاکستان میں اب تک عورتوں کو مردوں کے برابر تعلیمی ترقی کے مواقع دستیاب نہیں رہے اور ان کو تعلیمی سہولتیں بھی مردوں کے مقابلے میں کم حاصل

رہی ہیں۔ اگرچہ حکومت عورتوں کے لیے تعلیمی سہولتوں اور اداروں میں ترجیحی بنیادوں پر اقدامات کر رہی ہے جو بہت حوصلہ افزا ہے۔ تعلیم، کاروبارِ زندگی اور ملکی سیاست میں عورتوں کی شمولیت کے اقدامات سے عورتوں کے بارے میں حکومتی پالیسیوں میں خوش آئند تبدیلی آئی ہے جس سے معاشرتی ترقی کا عمل مزید بہتر ہونے کی توقع ہے۔

تعلیم نسواں میں کمی کی وجوہات

پاکستان میں عورتوں کی فی صد شرح خواندگی بہت کم ہے۔ اگرچہ حکومت عورتوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دے رہی ہے لیکن پھر بھی پچھلے 69 سالوں میں عورتوں کی شرح خواندگی میں تسلی بخش اضافہ نہیں ہوا۔ تعلیم نسواں میں کمی کی ممکنہ وجوہات درج ذیل ہیں۔

1- آبادی میں اضافہ

پاکستان کی آبادی میں جس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اُس کے لحاظ سے تمام افراد کے لیے عموماً اور عورتوں کے لیے خصوصاً تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا بہت مشکل ہوتا چلا جا رہا ہے۔

2- تعلیمی اداروں کی کمی اور دوری

آبادی میں عورتوں کی تعداد کی مناسبت سے تعلیمی اداروں کی کمی ہے۔ خصوصاً دیہی علاقوں میں قائم ہونے والے ایسے اداروں اور سکولوں کی تعداد آبادی کی ضروریات کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ خواتین کے لیے کھلنے والے سکول کم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے گھروں سے دور بھی ہیں۔ خصوصاً ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے شہروں میں ہونے کی وجہ سے زیادہ تر والدین اپنی بچیوں کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجنے کے لیے تیار نہیں۔

3- مخلوط تعلیم

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم بھی معاشرتی نکتہ نظر سے زیادہ تر والدین کی اقدار اور روایات سے مطابقت نہیں رکھتی اس لیے وہ اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے سے گریز کرتے ہیں۔

4- غیر موزوں نصاب

ماہرینِ تعلیم اور والدین کے مطابق طلبا و طالبات کے لیے یکساں نصاب عورتوں کی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ان کے خیال میں عورتوں کے لیے ان کی مستقبل کی ضروریات اور ذمہ داریوں کے مطابق نصاب تعلیم ترتیب دینا چاہیے۔ اسی لیے بعض والدین اپنی بچیوں کو تعلیم کے لیے سکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔

5- قدامت پسندی

پاکستانی معاشرہ رسوم و رواجات میں جکڑا ہوا ہے۔ خود ساختہ اقدار اور قبائلی روایات افراد کی زندگی خصوصاً خواتین کی زندگی پر بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان ہی رویوں اور اقدار کے باعث عورتوں کی تعلیم کو وقت اور پیسے کا ضیاع تصور کیا جاتا ہے۔ پھر پڑھے لکھے افراد میں بے روزگاری اور مایوسی کا رجحان ان کے رویے اور سوچ کو غلط تقویت دیتا ہے اور لوگ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ نہ ہونے کے باعث اپنے بچوں اور خصوصاً بچیوں کی تعلیم کو ضروری خیال نہیں کرتے۔

نظم وضبط کا فقدان

پاکستان کے تعلیمی مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ تعلیمی اداروں میں طلبہ کے نظم وضبط کا ہے جس کی وجہ سے اور بہت سے تعلیمی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ خصوصاً تعلیمی اداروں کا ماحول، تعلیم کا معیار اور معاشرتی رویے بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں خصوصاً سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں طلبہ اور اساتذہ دونوں تعلیم و تدریس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ طلبہ کے باہمی اور اساتذہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت میں بھی احترام، شفقت، رواداری اور برداشت جیسی اقدار آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ مختلف گروہوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔ ڈگریاں ہونے کے باوجود کارکردگی روبہ تنزل ہے۔ یہ ساری صورتحال نظم وضبط کے فقدان اور کمی کی نشاندہی کرتی ہے۔

کسی بھی گھر، معاشرے اور ملک کو کامیابی سے چلانے کے لیے نظم وضبط ایک لازمی عنصر ہے۔ زندگی کے معاملات انفرادی ہوں یا اجتماعی نظم وضبط کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ ہم جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسا کرنے کے لیے بعض اصولوں اور قوانین کی پابندی کرنا پڑتی ہے جن میں ہماری مرضی کا دخل بہت کم ہوتا ہے، مثلاً کالج کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات مقرر ہیں۔ اسی طرح نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کو سرانجام دینے کا طریقہ کار بھی طے ہے۔ یہ اصول، قاعدے اور قانون معاشرے کے افراد نے مل کر باہمی رضامندی سے طے کیے ہیں۔ لہٰذا معاشرے کا ہر رکن ان اصولوں اور قوانین پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے اور وہ اپنا ذاتی اختیار مرضی اور ارادہ ان قوانین اور اصولوں کے تابع کر دیتا ہے۔ ان اصولوں اور قوانین کی پابندی اور ان کے مطابق عمل کرنے کو ہی نظم وضبط کہا جاتا ہے۔ ٹریفک کے قوانین میں سرخ سگنل کے روشن ہونے کی صورت میں سڑک پار کرنا منع ہے۔ یہ ایک قانون اور اصول ہے جس کی خلاف ورزی کرنا اور اپنی مرضی کرنا بدنظمی کی مثال ہے۔

تعلیمی اداروں میں نظم وضبط سے بھی یہی مراد ہے کہ ان اداروں کے طے شدہ اصولوں اور قوانین پر پوری طرح سے عمل کیا جائے اور کوئی بھی ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی مرضی نہ کرے۔ اس طرح اپنی مرضی کو ادارے کے مقرر کردہ اصولوں اور قواعد وقوانین کے تابع کر دینا ہی 'نظم وضبط' کہلاتا ہے۔

اس عمل میں پرنسپل، اساتذہ، طلبہ اور ملازمین مقرر شدہ اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم ذمہ داری اساتذہ اور پرنسپل کی ہوتی ہے کہ وہ خود ان اُصول وقوانین کی پابندی کریں اور طلبہ سے بھی کروائیں۔ ادارے کے نظم وضبط کی خلاف ورزی اساتذہ اور طلبہ سمیت سب کے لیے قابل گرفت ہوتی ہے۔ ہر استاد کو علم ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ کیا کام ہے اور اس نے وہ کس طرح انجام دینا ہے۔ اسی طرح ہر طالب علم کو بھی پتا ہوتا ہے کہ اس نے کب، کہاں اور کس کی نگرانی میں کون سی سرگرمی میں حصہ لینا ہے اور کن قوانین کی پابندی کرنی ہے۔ ان کا مقصد اصل میں طلبہ کو بُری عادات اور اعمال سے روکنا ہوتا ہے تاکہ ان کی سیرت اور کردار کی بہتر تعمیر ہو سکے۔ مختصراً نظم وضبط افراد کے اپنے رویے، عادات، اعمال اور کام کرنے کے انداز پر کنٹرول کا ایسا عمل ہے جس میں فرد اپنے معاشرے یا ادارے کی طرف سے طے کردہ ضوابط اور اصولوں کے مطابق اپنی تمام سرگرمیاں اور اعمال انجام دے سکے۔

ہم اپنے اردگرد طلبہ میں نظم وضبط کے فقدان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ وہ ایسی ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جو ایک طرف تو تعلیمی اداروں کے نظم وضبط کے خلاف ہیں اور دوسری طرف معاشرتی اقدار اور سماجی اصولوں سے بھی کوئی مطابقت نہیں رکھتیں۔

طلبہ کی درج ذیل سرگرمیاں ہمارے تعلیمی اداروں میں نظم ونسق کے فقدان کی نشاندہی کرتی ہیں:۔

-1 کلاسوں سے بلاوجہ غیر حاضر رہنا۔

-2 کلاسوں کا بائیکاٹ۔

-3 طلبہ کے احتجاجی جلوس اور غیر قانونی اجلاس۔

-4 امتحانی مراکز میں ہنگامہ یا بائیکاٹ۔

-5 طلبہ کا سیاسی جماعتوں کی گروہ بندی کا حصہ بننا۔

-6 اساتذہ اور پرنسپل کے ساتھ غیر شائستہ رویہ۔

تعلیمی اداروں کے نظم وضبط میں کمی کے اسباب

تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور ملازمین میں عموماً اور طلبہ میں خصوصاً نظم وضبط کی خراب صورت حال انفرادی یا اجتماعی اسباب کے باعث ہوسکتی ہے جن میں سے بعض نمایاں اسباب درج ذیل ہیں۔

-1 والدین کی عدم توجہی اور لا پرواہی

بچوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش کی بنیادی ذمہ داری والدین کی ہوتی ہے۔تمام بچوں کو والدین کی بھرپور توجہ اور نگرانی کی اشد ضرورت ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے بہت سے والدین اپنی مصروفیات اور معاملات میں اس طرح اُلجھ گئے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔اس طرح وہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ نہیں دے سکتے۔ان کی بے توجہی اور لاپرواہی کے باعث بچوں میں بھی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی کے رویے پروان چڑھتے ہیں۔گھروں میں والدین کے باہمی جھگڑے،ان کے قول وفعل میں تضاد بچوں میں ایسی ہی چند عادتوں کو فروغ دیتا ہے جو ان میں صحیح اور غلط، اچھے بُرے اور جائز وناجائز کی تفریق ختم کردیتی ہیں۔ بہت سے بچے ایسے ہی پس منظر سے منفی رویے اور غلط عادات لے کر تعلیمی اداروں میں آتے ہیں جن کے باعث تعلیمی اداروں میں نظم وضبط کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

-2 اساتذہ کا کردار

اساتذہ ہمارے ہی معاشرے کا ایک حصہ ہیں۔معاشرے میں پائی جانے والی تمام خوبیاں اور خامیاں لیے ہوئے وہ نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے ذمہ دار ہیں۔وہ اپنے کم تر معاشرتی مقام، کم آمدنی اور محدود وسائل کے باعث سیاسی اور سماجی تفریق کا شکار ہیں۔ مادیت پرستی سے بھرپور معاشرے کے اثرات دوسرے لوگوں کی طرح ان کی تدریسی ذمہ داریوں اور فرائض پر اثرانداز ہو رہے ہیں۔ان میں سے بعض کمرۂ جماعت کے اندر ہی خود کو استاد سمجھتے ہیں باہر نہیں۔ طلبہ کی شخصیت سازی اور اخلاقی تربیت کو وہ اپنی ذمہ داری خیال نہیں کرتے۔کام کے غیر حقیقی بوجھ، غیر ضروری سرکاری ذمہ داریوں اور مالی فوائد کے حصول نے ان کو تدریس کے اصل کام سے دُور کردیا ہے۔مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی مداخلت کے باعث خود اساتذہ نظم وضبط کے مسائل کا شکار ہیں۔ان کے باہمی جھگڑے، عدم برداشت اور قول وفعل کا تضاد طلبہ میں گروہ بندی اور نظم وضبط کے مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

-3 سیاسی جماعتوں کا کردار

سیاسی جماعتیں اور سیاسی لیڈر بھی ملک کی ترقی، سیاسی اور معاشرتی استحکام کے لیے کام کرتے ہیں اور اسی طرح تعلیمی ادارے

کسی بھی ملک اور معاشرے کی نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے ذمہ دار ہوتے ہیں جہاں اساتذہ کا کام تعلیم دینا اور طلبہ کی ذمہ داری تعلیم حاصل کرنا ہے۔ دونوں کے فرائض اور ذمہ داریاں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں لیکن بدقسمتی سے پچھلے کئی سالوں سے ہمارے ملک کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں نے اساتذہ اور طلبہ میں اپنی ذیلی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ جس کی وجہ سے تعلیمی اداروں میں سیاسی گروہ بندیاں پروان چڑھتی ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ کی ایک مختصر لیکن منظم اور طاقتور تعداد مخصوص سیاسی جماعتوں کی آلہ کار بن کر اساتذہ، طلبہ اور تعلیمی اداروں میں گڑبڑ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے جس سے نظم وضبط کے شدید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

4- تعلیمی انتظامیہ کا کردار

ہر تعلیمی ادارے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اساتذہ، طلبہ اور ادارے کی فلاح وبہبود اور ترقی کو یقینی بنائے۔ لیکن تمام اداروں میں تعلیمی، تدریسی اور دیگر سہولتیں یکساں اور مناسب طور پر فراہم نہیں کی جاتیں جن سے ان اداروں کے طلبہ میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے جس کے ردعمل سے نظم وضبط کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ طلبہ کی کئی ایسی ضروریات اور سہولتیں جن کی فراہمی انتظامیہ کے اختیار میں ہوتی ہے صرف غیر ذمہ داری اور عدم توجہ کے باعث طلبہ کو فراہم نہیں کی جاتیں اور نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا بھی مناسب طور پر انعقاد نہیں کیا جاتا۔ ایسی صورت حال میں انتظامیہ کے لاتعلق اور غیر ذمہ دارانہ منفی رویہ کے باعث طلبہ احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں مخصوص سیاسی گروہ اور افراد صورت حال کو مزید خراب کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے نظم وضبط کے شدید مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

5- دیگر وجوہات

تعلیمی اداروں اور انتظامیہ کی طرف سے بعض اوقات طلبہ پر غیر ضروری تکلیف دہ اور ناروا پابندیاں بھی ان کو منفی رویے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ جن میں مخصوص کتب کی خریداری، ٹیوشن کے لیے پابند کرنا، مخصوص دکان سے سکول یونیفارم اور سٹیشنری کی خرید اور عدم تعمیل پر سزا دینا وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے بھی نظم وضبط کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ ملک کے سیاسی انتشار، منفی معاشرتی رویوں، غلط تعلیمی فیصلوں اور غیر یقینی صورت حال کے باعث طلبہ کو معاشرے میں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور امیر وغریب کے فرق کے باعث تعلیم ان کی نظر میں اپنی اہمیت کھو دیتی ہے اور وہ اضطراب اور بے چینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں وہ معاشرے اور اس کے نظام کے خلاف بغاوت اور جارحیت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

آبادی میں اضافہ

دنیا میں آبادی میں اضافے کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ صدی یعنی 1900ء کے آغاز میں دُنیا کی آبادی 160 کروڑ تھی جو 1999ء تک 600 کروڑ ہو گئی تھی اور اگر آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو اگلے پچاس سالوں میں یہ 12 ارب ہو جائے گی۔ ماہرین آبادی کہتے ہیں کہ جہاں آبادی کو دُگنا ہونے کے لیے صدیاں درکار ہوتی تھیں اب چند دہائیاں لگتی ہیں بلکہ پہلے جہاں آبادی میں ایک ارب کے اضافے کے لیے ایک صدی سے زیادہ عرصہ لگتا تھا۔ اب دس گیارہ سال میں ایک ارب کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین کے نزدیک آبادی میں اضافے کی یہ رفتار خاصی تشویش ناک ہے۔ اسی لیے اب عالمی سطح پر آبادی میں اضافے کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

پاکستان جس خطے میں واقع ہے اس کی آبادی 1901 سے لے کر اب تک 9 گنا بڑھ چکی ہے۔ یعنی 1947ء میں آبادی

تین کروڑ پچیس لاکھ تھی۔ 1951ء میں یہ آبادی تین کروڑ سینتیس لاکھ ہوگئی جبکہ 2016ء میں پاکستان کی آبادی تقریباً19 کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق پاکستان کی آبادی میں موجودہ شرح سے اضافہ ہوتا رہا تو 2020ء تک یہ آبادی 20 کروڑ سے بڑھ جائے گی جو قیام پاکستان کے وقت کی آبادی کے چھ گنا سے بھی زیادہ ہوگی۔ پاکستان 1951 میں کثرت آبادی والے ممالک میں چودھویں نمبر پر تھا۔

اضافہ آبادی اور تعلیم

پاکستان میں شرح خواندگی 1970 سے 2016 تک کے عرصے میں 21 فی صد سے بڑھ کر 60 فی صد ہوگئی ہے اور پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی سطح پر داخلوں میں بھی اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ آبادی میں تیز رفتار اضافہ کے باعث سکولوں اور کالجوں پر داخلوں کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور تعلیمی اداروں میں دو دو شفٹیں چلانے کے باوجود داخلے کے خواہش مند تمام امیدواروں کو داخلہ نہیں ملتا۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق سارے ملک کی 5 کروڑ 30 لاکھ آبادی ناخواندہ ہے۔ پرائمری جماعتوں میں داخلے کی عمر کے 3 کروڑ 50 لاکھ بچے ابھی سکولوں میں داخل نہیں ہو سکے۔ ملک کی آبادی میں موجودہ شرح اضافے کی وجہ سے تمام بچوں کو تعلیمی سہولتیں مہیا نہیں کی جاسکتیں۔ حکومت کی کوششوں کے نتیجے میں پاکستان کی شرح خواندگی میں سالانہ تقریباً ایک فی صد ہوتا ہے۔ آبادی کی شرح میں اضافہ 2.1 فی صد سالانہ ہے۔ اس طرح شرح خواندگی اور تعلیمی سہولتوں میں اضافے کے باوجود ہر سال ناخواندہ افراد کی تعداد میں پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اضافہ آبادی کی شرح میں زیادتی کی وجہ سے سکول جانے کی عمر کے تمام بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں میسر کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے اور سکول جانے والی عمر کے 15 فیصد بچے سکولوں سے باہر ہیں جبکہ داخل ہونے والے بچوں میں سے تقریباً نصف پرائمری پاس کرنے سے پہلے ہی سکول چھوڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ حکومت اپنی تمام تر کوشش کر رہی ہے کہ سکول جانے کی عمر کے تمام بچوں کو سکولوں میں داخلہ دیا جائے لیکن تیز رفتار شرح اضافہ آبادی کے باعث وسائل پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آ رہا ہے۔

معیار تعلیم

ہمارے معاشرے میں عموماً اور تعلیمی حلقوں میں خصوصاً ملکی معیار تعلیم کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ پچھلے سالوں کی نسبت معیار تعلیم زوال پذیر ہے اس تاثر کو پبلک سروس کمیشن اور قومی بھرتی کے بعض دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی رپورٹوں سے بھی تقویت ملی ہے۔ کیا واقعی ہمارا تعلیمی معیار پہلے کی نسبت گر گیا ہے یا صورت حال اس کے برعکس ہے۔ معیار تعلیم سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ اس کو کس طرح جانچا جاتا ہے۔ اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کون سے ہیں؟ کیا امتحانات کے نتیجے کے طور پر حاصل شدہ نمبروں، ڈویژنوں اور گریڈوں کو تعلیم کا معیار سمجھا جا سکتا ہے؟

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ اس کی خوبیوں، خامیوں اور صفات کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ جس چیز میں صفات اور خوبیاں دوسروں کی نسبت تعداد میں زیادہ مستقل اور پائیدار ہوں گی، ہم اس کے معیار کو زیادہ اچھا کہیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی چیز کے معیار کا تعلق اس میں خوبیوں کی تعداد، ان کے مستقل ہونے اور ان کے ویسی ہی کسی دوسری چیز کے موازنے سے کیا جاتا ہے۔ ہم بعض اشیا کے بارے میں مقداری یا ہندسی انداز میں پرکھ کرتے ہیں اور بعض کے بارے میں صفاتی

انداز اختیار کرتے ہیں، مثلاً ایک میز کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کو ہندسوں کہ یہ 4 فٹ لمبا، 2 فٹ چوڑا اور $1\frac{1}{2}$ فٹ اونچا ہے لیکن اس کے رنگ و روغن اور لکڑی کا جائزہ لیتے وقت ہم لکڑی اور رنگ کی صفات بیان کرتے ہیں کہ لکڑی اچھی ہے، بہت اچھی ہے یا خراب ہے۔ اس طرح پالش اچھی ہے۔ اس میں چمک ہے، اُترتی نہیں وغیرہ۔ اسی ہندسی اور صفاتی جائزے کی بنیاد پر ہم اشیاء کے معیار کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح تعلیم کے معیار کا فیصلہ بھی تعلیم کے ہندسی اور صفاتی جائزے اور پرکھ کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔

معیارِ تعلیم سے مراد تعلیم اور تعلیمی عمل میں شامل تمام عناصر کی خوبیوں اور صفات کی تعداد اور اُن کی پائیداری کے ایک ایسے موازنے کا نام ہے جو ایک کم از کم طے شدہ ہندسی یا صفاتی سطح سے کیا جاتا ہے۔

معیارِ تعلیم وہ کسوٹی ہے جس سے موازنہ کر کے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ طلبہ کی استعداد اور اکتساب میں کس حد تک اضافہ ہوا ہے، یعنی جب ہم طلبہ اور اساتذہ کی قابلیت، اُن کی مہارت، صلاحیت اور اکتساب کا نمبروں، فیصد یا اوسط وغیرہ کے لحاظ سے ہندسی انداز میں یا ڈویژن اور گریڈ کے لحاظ سے صفاتی انداز میں پہلے سے موجود یا کم از کم طے شدہ سطح سے موازنہ کر کے اس کو اچھا یا بُرا کہتے ہیں تو دراصل ہم تعلیمی معیار کی ہی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہم طلبہ کے حاصل کردہ انفرادی اور اجتماعی نمبروں، ان کی اوسط اور فی صد، مختلف مضامین میں حاصل کردہ نمبروں کی بنا پر سکولوں اور اساتذہ کے معیارِ تدریس کا اندازہ لگاتے ہیں لیکن یہ معیارِ تعلیم کو جانچنے کا ہندسی یا عددی پہلو ہے جس کی بنیاد پر معیارِ تعلیم کا حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے نمبر لگانا ممکن نہیں ہوتا مثلاً کسی طالب علم کی تحریر کا انداز کتنا اچھا اور خوبصورت ہے۔ اس کے کام کرنے کے طریقے کتنے اچھے اور اصولوں کے مطابق ہیں۔ اس کا اندازِ گفتگو کیسا ہے یا پھر کسی تعلیمی ادارے نے نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں کتنے انعامات اور پوزیشنیں لی ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ نے کس قدر تعلیمی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ادارے کے فارغ التحصیل طلبہ نے حاصل شدہ علم اور تربیت سے عملی زندگی میں کیسے فہم، ادراک اور اطلاق کا مظاہرہ کیا۔ ان سرگرمیوں اور صفات کے نمبر لگانا اگرچہ ناممکن تو نہیں لیکن نسبتاً مشکل ہے۔ لوگ عام طور پر ان معاملات اور سرگرمیوں سے طلبہ، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے معیار کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ان کو بہت بہتر، بہتر، درمیانہ اور درمیانے سے کم یا خراب کے نام دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بھی دراصل معیار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ہے جو معیارِ تعلیم جانچنے کا صفاتی پہلو ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک طالب علم ہندسی اعتبار سے 85 فیصد نمبر لے کر امتحان میں کامیاب ہو جائے لیکن اپنے علمی فہم و ادراک اور اطلاق کے لحاظ سے مطلوبہ صلاحیت نہ رکھتا ہو جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ معیارِ تعلیم کا تعین ہندسی اور صفاتی دونوں پہلوؤں سے کیا جائے۔

ہم اپنے طلبہ اور اساتذہ سے کیا توقعات رکھتے ہیں، ان کی کارکردگی کو کیسا اور کس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ توقعات نصاب میں مقاصد کے طور پر شامل ہوتی ہیں اور یہی مقاصد معیارِ تعلیم کا تعین کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات بطورِ خاص یاد رکھنا ضروری ہے کہ معیارِ تعلیم دراصل طلبہ، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کی کارکردگی، صلاحیت، استعداد اور اکتساب کی کم سے کم حد ہے جس کی زیادہ سے زیادہ حد کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ان سے کم ہونے کی صورت معیارِ تعلیم کے گرنے کا اشارہ ہوتا ہے جو قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ کسی بھی ملک یا معاشرے کے تعلیمی معیار کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ معیارِ تعلیم میں بہتری آ جائے، دوسری تعلیم کا معیار گر جانا اور تیسری اس کی ایک ہی سطح پر برقرار رہنا۔ معیارِ تعلیم کی ان سب صورتوں کے پیدا ہونے کے کئی عوامل ہو سکتے ہیں۔ اگلے صفحات میں ہم بعض ایسے عوامل کا ذکر کریں گے جو ممکنہ طور پر معیارِ تعلیم کی پستی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ان عوامل پر قابو پا لینے سے تعلیمی معیار میں بہتری کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اساتذہ

کسی بھی نظام تعلیم میں تعلیم وتدریس کے حوالے سے اساتذہ بنیادی اور سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر تعلیمی اداروں میں قابل اور بہتر تربیت یافتہ اساتذہ کی مناسب تعداد موجود نہ ہو جو تدریس سے لگاؤ رکھتے ہوں اور ذمہ داری اور دلجمعی سے اپنے فرائض انجام دیں یا سیاسی تعلق کی بنا پر اپنی ذمہ داریوں سے غفلت اختیار کریں۔ تدریس کو مشن کی بجائے مادی منفعت خیال کریں۔ اپنے مضمون پر عبور نہ رکھیں۔ اپنی تربیت اور تعلیم کا مؤثر استعمال اور اطلاق نہ کریں اور ان کی ذاتی زندگی تضادات کا شکار ہو تو بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کس طرح ممکن ہے۔ اس لیے ایسی صورت حال میں تعلیم میں پستی آنا یقینی ہوتا ہے۔

نصاب

اساتذہ کے بعد تعلیمی معیار پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے اہم ترین عوامل میں سے ایک نصاب ہے۔ ہم اپنے طلبہ اور اساتذہ کی کارکردگی کو کیسا اور کس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں نصاب اسی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ نصاب میں دیے گئے مقاصد اور مواد ہی تعلیمی معیار کا تعین کرتے ہیں۔ اگر نصاب میں متعین شدہ مقاصد، طلبہ اور معاشرے کی حقیقی ضروریات کے مطابق نہیں اور وہ طلبہ کو عملی زندگی کے لیے تیار نہیں کرتے تو معیار تعلیم پستی کی طرف جائے گا۔ اگر امتحان اور نصاب میں مطابقت نہ ہو۔ طلبہ علم کی بجائے نمبروں کے لیے کوشاں ہوں۔ تخلیقی کام کرنے والے طلبہ کی شنوائی نہ ہو تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ طلبہ کی علمی مہارتیں اور اکتساب بہتر ہو سکے۔ جب طلبہ کی علم سے دلچسپی ہی نہیں ہوگی اکتساب بہتر نہیں ہوگا۔ علمی کمال نہیں ہوگا تو معیار کہاں باقی رہے گا۔

والدین

بچے کی تعلیم کا اولین گہوارہ گھر ہے جہاں اس کے والدین، بہن بھائی اور عزیز رشتہ دار ہوتے ہیں۔ گھر میں رہنے والے افراد کے رویے اور بچے کی طرف ان کی توجہ کا تعلیم کے معیار سے گہرا تعلق ہے۔ والدین کا ان پڑھ یا کم تعلیم یافتہ ہونا اور تعلیم کی طرف ان کا منفی رویہ بھی تعلیم کے معیار کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کے رجحان، صلاحیت یا دلچسپی کے بارے میں علم نہیں رکھتے۔ وہ ان کی صلاحیتوں کے برعکس ان سے غیر حقیقی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور ان کو ایسے مضامین پڑھنے اور پروگراموں میں داخلے لینے کے لیے مجبور کرتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں اور قابلیت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں یقینی طور پر طلبہ کی کارکردگی توقعات کے مطابق نہیں ہوتی لہذا تعلیمی معیار کی پستی یقینی ہو جاتی ہے۔

سماجی ومعاشی حالات

ملک اور معاشرے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات بھی براہِ راست تعلیم کے معیار کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر ملک میں سیاسی عدم استحکام ہو، ہڑتالوں، ہنگاموں اور جلسے جلوسوں کے باعث کاروبار زندگی معطل ہوتا رہے۔ طلبہ ہڑتالیں کر رہے ہوں اور اساتذہ کلاسوں کا بائیکاٹ کر دیں۔ انصاف کے مقابلے میں دھونس، دھاندلی اور سفارش عام ہو۔ حق دار کو اس کا حق نہ ملے۔ لوگ غیر مہذب اور غیر اخلاقی ذرائع سے ناجائز مراعات حاصل کر رہے ہوں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا رواج عام ہو تو طلبہ اور اساتذہ کی توجہ تعلیم پر نہیں رہتی۔ طلبہ ناجائز ذرائع پر زیادہ بھروسہ کرنے لگتے ہیں اور اساتذہ مادی منفعت کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں تعلیمی نظام کے اصول وضوابط سے ان کا یقین اٹھ جاتا ہے۔ طلبہ کے نتائج خراب اور اساتذہ کی کارکردگی مایوس کن ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ سب عوامل تعلیمی معیار میں کمی اور زوال کا باعث بن جاتے ہیں۔

اقتصادی حالات

ملک کی اقتصادی حالت براہِ راست تعلیم کے معیار کو متاثر کرتی ہے۔ تعلیمی اداروں کی اچھی کارکردگی میں اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ تعلیمی سہولتوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اگر کسی ادارے میں پانی، بجلی، چاردیواری اور کمروں کی موزوں اور مناسب سہولیات دستیاب نہیں، طلبہ کی تعداد گنجائش سے زیادہ ہے، ان سب کی کلاس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں، لائبریری اور لیبارٹریاں یا تو موجود نہیں یا ان میں ضروری سامان عملہ اور سہولیات میسر نہیں تو موثر تعلم و تدریس مشکل ہوجاتی ہے۔ اس طرح ضروری طبعی اور تعلیمی سہولتوں کی عدم موجودگی تعلیمی معیار کی پستی کا باعث بنتی ہے۔

انفرادی اختلافات اور عدم مطابقت

تمام طلبہ میں انفرادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض زیادہ ذہین ہوتے ہیں بعض کم۔ وہ سماجی اور اقتصادی اعتبار سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پھر اُن کا کسی خاص مضمون، سرگرمی یا پیشے کی طرف رجحان ہوتا ہے لیکن والدین، رشتہ دار یا بہن بھائی اپنی پسند یا ناپسند کی بنا پر بچوں کو ایسے مضامین یا پروگراموں میں داخلہ کے لیے مجبور کردیتے ہیں جو اُن کی اپنی دلچسپی، پسند، مہارت اور صلاحیت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ جس کی وجہ سے تعلیم اُن کے لیے دلچسپی کی بجائے بوجھ بن جاتی ہے اور یہ بے مقصد تعلیم معیار کی گراوٹ کا اہم سبب بن جاتی ہے۔

کم داخلہ اور ترکِ مدرسہ

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ملکی آبادی میں تیز رفتار اضافے کے باعث سکولوں میں داخل ہونے والے بچوں کی تعداد پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

سال 2004ء کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں پرائمری سطح پر تعلیم میں شمولیت کی شرح 83 فیصد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں 5 سے 10 سال کی عمر کے کل بچوں کی تعداد کا 83 فیصد رسمی یا غیر رسمی انداز میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ حکومت پاکستان کے ایجوکیشن سیکٹر ریفارمز پروگرام کے ایکشن پلان (05-2001ء) کے مطابق پرائمری سکولوں میں حقیقی شرح داخلہ 66 فیصد ہے جس میں 82 فیصد لڑکے اور 50 فیصد لڑکیاں شامل ہیں۔

سطح	مجموعی شرح شمولیت	لڑکوں کی شرح شمولیت	لڑکیوں کی شرح شمولیت	سکولوں سے باہر بچے
پرائمری	66 فیصد	98 فیصد	50 فیصد	34 فیصد

اس کا مطلب یہ ہے کہ سکولوں میں پرائمری تعلیم حاصل کرنے کے لیے پانچ سے دس سال کی عمر کے 34 فیصد بچے ابھی تک سکولوں میں داخل نہیں ہوئے۔ سکولوں سے باہر رہ جانے والے ان بچوں کی تعداد 55 لاکھ کے قریب ہے۔ جب کہ سکولوں میں داخلہ لینے والے 66 فیصد بچوں میں 82 فیصد لڑکے اور 50 فیصد لڑکیاں ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ پرائمری تعلیم کے لیے سکول جانے کی عمر کے 18 فیصد لڑکوں اور 50 فی صد یعنی لڑکیوں کی نصف تعداد سکول سے باہر ہے۔ یہ ساری صورت حال مزید پریشان کن یوں نظر آتی ہے کہ سکولوں میں داخلہ حاصل کرنے والے ان 66 فیصد بچوں میں سے تقریباً 50 فیصد یعنی نصف تعداد اور پرائمری سطح تک کی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی سکول چھوڑ دیتی ہے۔ اکنامک سروے آف پاکستان کے (16-2015ء) کے مطابق پرائمری سطح پر تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ میں سے نصف سے زیادہ بچے پہلے دو تین سالوں میں مختلف وجوہ کی بنا پر سکول چھوڑ جاتے ہیں اور بمشکل 30 فیصد بچے پرائمری پاس کرتے ہیں۔

یوں تو ہر فرد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد تعلیمی ادارے سے فارغ ہو جاتا ہے لیکن بعض طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تعلیم مکمل کئے بغیر ہی سکول چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ طلبہ نہ تو اپنے سکول سے کوئی سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی کسی اور سکول میں داخلہ لیتے ہیں۔ یہ بچے پہلی سے پانچویں جماعت کے درمیان تعلیم کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور باقاعدہ نصاب کے مطابق مقررہ مدت تک سکول میں تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ ایسے طلبہ کو تارکِ مدرسہ اور اس صورت حال کو ترک مدرسہ کا نام دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تارک مدرسہ سے مراد ''ایسا طالب علم ہے جو اپنی ذہنی پسماندگی یا کسی سماجی، نفسیاتی یا اقتصادی وجوہات کے باعث کسی بھی درجہ میں تعلیم ادھوری چھوڑ دیتا ہے اور سکول سے اپنا تعلیمی رابطہ منقطع کر لیتا ہے''۔

تارک مدرسہ کی اس اصطلاح کا اطلاق مختلف ملکوں میں مختلف انداز میں کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں یہ اصطلاح ان بچوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو ملکی قانون کے مطابق بارھویں جماعت تک تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ کر تعلیم کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں لازمی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے والے بچوں کو تارک مدرسہ کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں اس اصطلاح کا استعمال عموماً پرائمری سطح کی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے سکول چھوڑ جانے والے بچوں کے لیے کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں ترک مدرسہ کی وجوہات

پاکستان تعلیمی لحاظ سے دنیا کے بہت سے ممالک سے پیچھے ہے۔ ہماری شرح خواندگی بھی کوئی زیادہ قابل فخر نہیں ہے۔ پرائمری سطح پر ترک مدرسہ کی شرح 50 فیصد ہے۔ بچیوں میں یہ شرح اور بھی زیادہ ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ تعلیمی شعبے میں ہم اس صورت حال سے کیوں دو چار ہیں۔ چھوٹی عمر کے بچے اور بچیاں کیوں تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟ ترک مدرسہ کے اسباب کیا ہیں؟ ذیل میں بعض ایسے اسباب کا ذکر کیا گیا ہے جو بچوں کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

1- غربت

ہمارے ملک کی زیادہ آبادی ایسے طبقے سے تعلق رکھتی ہے جو مفلسی اور تنگ دستی میں زندگی گزارتے ہیں۔ اول تو روزگار ہی نہیں ملتا اور اگر مل بھی جائے تو آمدنی اور ضروریات میں توازن ہی نہیں رہتا۔ مہنگائی نے غربت میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے پھر تعلیمی اخراجات میں اضافے نے مالی بوجھ کو بڑھا دیا ہے۔ شروع میں سب والدین عموماً اپنے بچوں کو سکول میں داخل کرا دیتے ہیں لیکن بعد میں سکول کے اخراجات برداشت نہ کرنے کے باعث ان کی تعلیم ختم کروا کر سکول جانے کا سلسلہ بند کر دیتے ہیں اور انہیں گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے ورکشاپوں، ہوٹلوں اور دوسرے کاموں میں لگا دیتے ہیں۔ اس طرح والدین بچوں کے لیے تعلیم کی اہمیت کو پس پشت ڈال کر گھریلو ضروریات پوری کرنے کے لیے آمدنی کو ترجیح دیتے ہیں۔

2- لوگوں کا عمومی رویہ

بچوں کے سکول چھوڑنے کی ایک وجہ تعلیم کے بارے میں عام لوگوں کی یہ سوچ ہے کہ تعلیم حاصل کرنا صرف وقت کا ضیاع ہے۔ کیونکہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک تو ملازمت نہیں ملتی اور دوسری طرف تعلیم یافتہ بچہ محنت مزدوری کرنے کو عار سمجھتا ہے اور محنت کی عظمت کا اصول قابل عمل نہیں سمجھتا۔ کم آمدنی والے غریب والدین کے خیال میں تعلیم پر تو خرچ آتا ہے جب کہ کام کرنے والا بچہ گھر پر بوجھ بھی نہیں بنتا بلکہ گھر کی آمدنی میں اضافہ کرتا ہے اور خاندان کا سہارا بن جاتا ہے۔ اس لیے ایسے والدین اپنے بچوں کو سکولوں سے نکال کر ایسے کاموں میں لگا دیتے ہیں جس سے وہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنی اور گھر کی مالی ضروریات پوری کر سکیں۔

3- گھریلو کام اور ذمہ داریاں

ہمارے لوگوں کی اکثریت روایتی معاشرتی اقدار کی پیروکار ہے جس میں بچوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ والدین کی ذمہ داریوں اور گھریلو کاموں میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ بچے دکانوں اور کھیتوں وغیرہ میں والد کے کام میں مددگار ہوتے ہیں۔ بچیوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خانہ داری اور گھریلو ذمہ داریوں میں ماں کی مدد کریں گی۔ اس وجہ سے عام طور پر ایسے لڑکوں جب کہ خصوصاً لڑکیوں کو سکول میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑ جاتی ہے اور یوں وہ ترک مدرسہ میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

4- اساتذہ کی تربیت اور رویہ

پاکستان میں قبل از ملازمت تربیت یافتہ اساتذہ کے تمام پروگرام روایتی انداز میں چلائے جا رہے ہیں جس میں تربیت کے عملی اور اطلاقی پہلو پر مناسب توجہ نہیں دی جاتی۔ زیادہ تر اساتذہ بچوں کی نفسیات، تدریسی اصولوں اور طریقوں سے ناواقف ہیں۔ دوران ملازمت ریفریشر کورسز کا بھی صحیح طور پر انعقاد اور استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس صورت حال میں اساتذہ کا ناروا سخت گیر رویہ، مار پیٹ اور بے جا ڈانٹ ڈپٹ بچوں کے ذہنوں میں سکول سے بھاگنے اور تعلیم ادھوری چھوڑنے کا باعث بنتی ہے۔

5- سکولوں کی حالت اور سہولتیں

پاکستان میں پرائیویٹ شعبہ کی نسبت سرکاری شعبہ میں چلنے والے سکولوں کی حالت زیادہ قابل رشک نہیں۔ خصوصاً ان پرائمری سکولوں کی حالت جو دیہی علاقوں میں واقع ہیں غیر تسلی بخش اور غیر دلکش ہے۔ عموماً سکولوں میں ضروری تعلیمی سہولتوں کا فقدان ہے جن میں پینے کا پانی، بجلی، کمرہ جماعت حتیٰ کہ بیٹھنے کی سہولتوں کی کمی نمایاں ہیں۔ سکول کا ایسا ماحول بچوں کو اچھا ہی نہیں لگتا۔ اس لیے وہ اول تو سکول آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے اور اگر آ جاتے ہیں تو جلد از جلد سکول سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح ترک مدرسہ کا باعث بنتے ہیں۔

6- غیر موزوں نصاب

والدین اور عام لوگوں کے خیال میں تعلیم کی اہم ذمہ داری بچوں کو روزمرہ زندگی کے معاملات میں کامیابی سے حصہ لینے کے قابل بنانا ہے لیکن ہمارے پرائمری سطح کے تعلیمی نصاب میں کوئی ایسی مہارت یا مواد شامل نہیں جو بچوں کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرے اور کسی پیشے کو اپنانے میں مددگار ہو۔ نصاب ضرورت سے زیادہ طویل، بچوں کی ذہنی سطح سے بلند اور دلچسپیوں کے مطابق نہیں بلکہ مضامین کی تعداد اور بستے کے وزن میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ نصاب والدین کی توقعات پر پورا نہیں اترتا خصوصاً وہ والدین جو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اپنے بچوں کو تعلیم کی بجائے ہوٹلوں، ورکشاپوں یا ایسے کاموں میں لگا دیتے ہیں جہاں وہ کوئی فن یا کام سیکھ کر روزگار کمانے کے قابل ہو سکیں۔

7- امتحان میں ناکامی

کئی ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو بعض نفسیاتی، سماجی یا تعلیمی مسائل اور مشکلات کے باعث تعلیم پر پوری توجہ نہیں دے سکتے اور امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں جس سے اُن کے مسائل میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اُن کے گھر والوں اور ساتھیوں کا رویہ اُنھیں

احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے جس کے بعد اُن کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ اُنہیں سکول، امتحان اور کتابیں اچھی نہیں لگتیں اس لیے وہ سکول سے کترانا شروع کر دیتے ہیں اور بالآخر سکول چھوڑ جاتے ہیں۔

ترک مدرسہ کے ان عمومی اسباب کے ساتھ ساتھ بعض اوقات لوگوں کی بعض ذاتی مجبوریاں اور مسائل بھی بچوں کے سکول چھوڑنے کا باعث ہوتی ہیں جن میں والدین کے باہمی جھگڑے، علیحدگی اور بے توجہی، بچوں کی بیماری، سکول کی دُوری اور وسائل آمدورفت کا نہ ہونا شامل ہیں۔

ترک مدرسہ پر قابو پانے کے اقدامات

پاکستان کے عوام اور حکومت کے لیے یہ بڑا لمحہ فکریہ ہے کہ ہم ابھی تک تعلیمی عمر کے بچوں کو سکول میں نہیں لا سکے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جو بچے کسی نہ کسی طرح سکول میں داخل ہو جاتے ہیں ان کو بھی کم از کم پانچویں تک تعلیم مکمل کرنے تک سکولوں میں نہیں روک سکتے بلکہ اُن میں سے قریباً نصف پانچویں جماعت تک تعلیم مکمل کرنے سے پہلے تارک مدرسہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ حکومت نے اس سلسلے میں بہت سے اہم اقدامات کیے ہیں لیکن ابھی اس ضمن میں بہت کام کرنا باقی ہے۔ ترک مدرسہ کو کم کرنے اور سکولوں میں داخلے بڑھانے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اقدامات سے صورت حال میں بہتری آسکتی ہے۔

i- ملک کے ہر اس علاقے میں جہاں بچوں کی تعداد کے مطابق سکول موجود ہوں ان علاقوں میں پانچویں جماعت تک تعلیم لازمی کر دی جائے۔

ii- ملک کے جن علاقوں میں سکول کم ہیں وہاں غیر سرکاری تنظیموں اور پرائیویٹ لوگوں کو سکول کھولنے کے لیے مدد دی جائے اور تعلیم دینے کے لیے رسمی کے ساتھ غیر رسمی اور نیم رسمی طریقے اختیار کیے جائیں۔

iii- ملک میں ثانوی سطح تک تعلیم بالکل مفت کر دی جائے۔ خصوصاً پرائمری سطح تک فوری طور پر مفت تعلیم کا قانون نافذ کر دیا جائے۔ پرائمری سطح پر تمام بچوں کو کتابیں، کاپیاں اور تعلیم کے لیے ضروری دیگر لوازمات مفت فراہم کیے جائیں۔

iv- سکول میں غیر حاضر نہ ہونے والے اور اچھی تعلیمی پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو وظائف دیے جائیں۔ خصوصاً لڑکیوں کو سکولوں میں اچھی حاضری کے لیے تعلیمی وظیفہ دیا جائے۔

v- سکولوں میں تعلیم کے لیے درکار سامان اور طبعی سہولیات ترجیحی بنیادوں پر فراہم کی جائیں۔ اُن کو خوبصورت اور پُرکشش بنایا جائے تاکہ بچے شوق سے آنا پسند کریں اور ان کو ایسا اچھا تعلیمی ماحول دیا جائے کہ وہ ترک مدرسہ کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

vi- پرائمری سکولوں میں پڑھانے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ تربیت رکھنے والے اساتذہ کو مقرر کیا جائے اور ان کی تربیت کے نظام کو بہتر اور موثر بنایا جائے۔

vii- پرائمری سطح پر تعلیم کی ساری ذمہ داری خواتین اساتذہ کے سپرد کرنے کا اصولی فیصلہ کیا جائے اور اس سطح پر بچوں اور بچیوں کو اکٹھی تعلیم دی جائے۔

viii- نصاب تعلیم خصوصاً پرائمری سطح کے نصاب تعلیم عملی زندگی کے کاموں اور ضروریات سے ہم آہنگ کیا جائے اور مضامین کے غیر ضروری بوجھ کی بجائے عملی کام اور مہارتیں شامل کی جائیں جو بچوں میں محنت کی عظمت اُجاگر کریں۔

ix- امتحانات کے موجودہ نظام کو بدلا جائے جس سے بچے نمبر حاصل کرنے کے لیے رٹہ لگانے پر مجبور ہیں۔ پرائمری سطح پر پاس فیل ہونے کے تصور کو بدل دیا جائے تاکہ فیل ہونے کا امکان ہی نہ رہے اور بچے مسلسل اپنے علم میں اضافہ کرتے رہیں۔

x- پرائمری سطح تک کے امتحان کو عملی نوعیت کا امتحان بنایا جائے تاکہ بچے رٹے اور نمبروں کی دوڑ میں شریک ہونے سے بچ سکیں اور ہر بچہ اپنی قابلیت اور اکتساب کی رفتار کی بنیاد پر تعلیم حاصل کرتا رہے۔

تعلیم کے بارے میں عمومی رویہ

تعلیم ایک سماجی سرگرمی ہے اور تعلیمی ادارے سماجی ادارے ہیں جو معاشرے کی اقدار اور سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تعلیم کی ذمہ داریوں میں سے اہم ذمہ داری افرادِ معاشرہ کی شخصیت کی ہمہ پہلو نشوونما ہے تاکہ وہ اپنی تمام تر معاشرتی ذمہ داریوں کو بطریق احسن پورا کر سکیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ تعلیم کسی معاشرے کے مجموعی طرزِ حیات اور سوچ پر مبنی ہوتی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں دیگر سماجی اداروں کی نسبت تعلیم کو دی جانے والی اہمیت سے اس معاشرے میں تعلیم کے مقام اور معیار کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے کی سوچ اور رویے براہِ راست تعلیم پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کا قیام اور تعلیم کا انتظام و انصرام کرنا براہِ راست معاشرے ہی کی ذمہ داری ہے۔ معاشرہ ہی تعلیم کے لیے سرمایہ اور سہولیات فراہم کرتا ہے تاکہ نئی نسل کی تربیت کا کام ہو سکے۔ تعلیم کا عمل معاشرے کی شعوری کوشش ہے جو وہ سماجی ترقی کے لیے کرتا ہے۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی معیشت رکھنے والا ملک ہے جس کی آبادی تقریباً 19 کروڑ اور خواندگی 60 فیصد ہے۔ اس آبادی کا 35 فیصد حصہ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ ملک کا شمار اب بھی ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے۔ تعلیم کا معیار بھی بہت اچھا نہیں اور نہ ہی مؤثر انداز میں تعلیمی منصوبہ بندی کی گئی ہے جو لوگوں کے تعلیم کی طرف عمومی رویے کو بہتر بنا سکے بلکہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں نے عام لوگوں کو تعلیم کی اہمیت سے غافل کر دیا ہے۔ رہی سہی کسر طبقاتی نظامِ تعلیم نے پوری کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ خصوصاً غریب طبقہ تعلیم حاصل کرنے کو وقت کا ضیاع تصور کرتا ہے۔

دنیا کے دیگر معاشروں کی طرح پاکستانی معاشرہ بھی مختلف طرح کے سماجی درجات میں بٹا ہوا ہے۔ ہر طبقہ کی سوچ اور رویہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہے۔ ان کی یہی سوچ تعلیم اور تعلیمی نظام میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کا نظامِ تعلیم بھی بعض لوگوں کے خیال میں طبقات میں تقسیم ہے اور سماجی طور پر طبقاتی تفریق کا باعث ہے۔ ملک کی کثیر آبادی غربت کی زندگی گزار رہی ہے اور یہ طبقہ عددی اعتبار سے معاشرے میں سب سے بڑا ہے۔ ان لوگوں کی آمدنی محدود اور قلیل ہوتی ہے جن کی بدولت وہ اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ اپنی بنیادی ضروریات یعنی کھانا پینا اور رہنا بھی پورا کر سکیں۔ مشکل معاشی حالات کے باعث یہ طبقہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے قاصر رہتا ہے۔ تعلیم ان کے لیے بنیادی ضرورتوں میں شمار نہیں ہوتی بلکہ کھانا پینا سب سے اہم ہوتا ہے۔ اس لیے اس طبقے کا ہر فرد یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں بھی کام کرتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جن کو اس عمر میں سکولوں میں ہونا چاہیے تھا لیکن دن رات کی محنت و مشقت کے باوجود بھی ان کو آرام نہیں ملتا۔ بُری معاشی حالت کے سبب یہ زندگی کی دوسری سہولتوں سے بھی محروم رہتے ہیں اور ساری عمر تعلیم کی اہمیت کو نہیں جان سکتے بلکہ تعلیم کے لیے منفی رویہ رکھتے ہیں اور اس کو اسراف خیال کرتے ہیں۔

آبادی کا ایک بڑا حصہ متوسط طبقے میں شمار ہوتا ہے۔ ان میں سرکاری ملازم، چھوٹے کسان اور تاجر لوگ شامل ہیں۔ ان لوگوں کے ذرائع آمدنی محدود ہوتے ہیں جو ان کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل نہیں کر پاتے۔ معاشرے میں حاصل سماجی مقام کو نبھانے کی خاطر اُن کی زندگی کی ضروریات اور تقاضے دوسرے طبقات سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اپنے معاشی مقام، رتبہ اور عہدے کو ملحوظ خاطر رکھتے رکھتے معاشی اور معاشرتی طور پر ہمیشہ دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔

معاشرے کا یہ طبقہ اقتصادی مشکلات کا شکار رہتا ہے اور ان مشکلات کو دُور کرنے اور قابو پانے کے لیے تعلیم کا سہارا لیتا ہے۔ زیادہ تر اسی طبقہ کے لوگ تعلیم کو سرمایہ کاری خیال کرتے ہیں اور اپنے معاشی اور معاشرتی مقام کو بلند کرنے کے لیے خود اور اپنے بچوں کو تعلیم کی طرف مائل کرتے ہیں۔ معاشرے کا یہ طبقہ تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنی اولاد کو بہتر سے بہتر تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اچھی سے اچھی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور بڑے سے بڑے عہدے پر فائز ہو کر اچھا اور اعلیٰ معاشرتی مقام اور سماجی رتبہ حاصل کریں۔ عموماً اس طبقے میں تعلیم کو بچیوں کے لیے بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن عموماً معاشی اور بعض دفعہ معاشرتی مجبوریوں اور مسائل کے باعث اُن کو تعلیم مکمل کرنے نہیں دی جاتی۔ تعلیم دلوانے کے معاملے میں عموماً لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

پاکستان کی آبادی کا ایک چھوٹا لیکن مؤثر طبقہ جو صنعت کاروں، جاگیرداروں، سرداروں اور وڈیروں کا ہے جو اعلیٰ طبقہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ طبقہ دولت کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں مؤثر اختیارات بھی رکھتا ہے۔ بعض لوگ ان کو سرمایہ داروں کا طبقہ بھی کہتے ہیں۔ پہلے دونوں طبقوں پر ان کی حکمرانی رہتی ہے۔ ان کے نزدیک دولت تمام مسائل کا حل ہے اور یہی معیارِ زندگی کو جانچنے کا پیمانہ ہے۔ اگرچہ اس طبقے کے نزدیک تعلیم بہت زیادہ اہم نہیں ہوتی لیکن یہ اپنے مرتبے اور مقام کو قائم ودائم رکھنے کے لیے اپنے بچوں کو بڑے مہنگے ملکی اور غیر ملکی اداروں میں تعلیم دلواتے ہیں، انہی کی وجہ سے ملک میں تعلیم کے میدان میں یکسانیت موجود نہیں بلکہ نظامِ تعلیم بھی طبقاتی بن چکا ہے جس سے معاشرے میں بہت سے سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کے تناظر میں پاکستانی معاشرے کی جو صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے اُس کے مطابق معاشرے کے افراد میں معاشرتی اور معاشی تفاوت بڑھ رہا ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ مادہ پرستی کی دوڑ میں برابر کے شریک ہیں۔ سماجی اقدار روز بروز کمزور پڑتی جا رہی ہیں اور یہی عمومی رویہ تعلیم کے بارے میں بھی بنتا چلا جا رہا ہے۔ سماجی اور معاشی رویوں کے حوالے سے علم کو معاشرے میں وہ مقام حاصل نہیں ہے جو اس کا ہونا چاہیے۔ تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری نے بھی تعلیم کی وقعت کو عام لوگوں کے دلوں سے بہت کم کر دیا ہے۔

عمومی رویہ کی بہتری کے لیے حکومتی اقدامات

حکومت پاکستان نے اس ساری صورت حال کا احساس کرتے ہوئے تعلیم کو اپنی اولین ترجیحات میں شامل کر لیا ہے۔ تعلیم کی ترقی کے لیے زیادہ اور خصوصی بجٹ فراہم کیا جا رہا ہے۔ ملک میں تعلیم کے فروغ کے لیے ابتدائی سے لے کر اعلیٰ سطح تک سہولیات فراہم کرنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ خصوصاً بچیوں کی تعلیم کے لیے نمایاں کوششیں جاری ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم خواندگی اور سپیشل بچوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ محکموں کا قیام حکومت کی تعلیم کے میدان میں سنجیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کی جانب سے ملکی اور غیر ملکی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بلاتخصیص میرٹ کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ

حکومت تعلیمی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد اور ان کے تعلیمی معیار اور سہولتوں میں اضافہ کے لیے بھی کوشاں ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ حکومت کے بارے میں رویے کو بہتر بنانے میں بہت مدد ملے گی۔

تعلیم میں سرمایہ کاری (Investment in Education)

آج تک کے تمام ماہرین معاشیات تعلیم کی معاشی اور اقتصادی افادیت کے ہمیشہ سے قائل رہے ہیں اور سب کے سب تعلیم کو انسانی وسائل کو ترقی دینے کے لیے ضروری سرمایہ کاری خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کسی بھی ملک و معاشرے کی معاشی ترقی کے لیے انسانی وسائل اور بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتی ہے۔ کسی ملک میں پڑھے لکھے افراد ہی تعلیم، صنعت، تجارت، زراعت، بینکنگ، میڈیسن غرض ہر شعبہ زندگی کو کامیابی سے چلانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ملک کی حیثیت، معیشت، سیاست اور ثقافت ترقی کرتی ہے۔ افراد جس قدر بہتر تعلیم یافتہ ہوں گے اس قدر ہی ملک کا بنیادی ڈھانچہ مضبوط ہوگا اور اتنا ہی زیادہ ملک ترقی کرے گا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ملکی ترقی کے لیے انسانی وسائل کی نسبت مادی وسائل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً زمین اور پانی کے بغیر زرعی ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح معدنیات کے بغیر صنعتی ترقی مشکل ہے لیکن آج یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ جاپان میں کوئلہ، لوہا، تیل یا کوئی اور معدنیات دستیاب نہیں لیکن وہ دنیا کے انتہائی صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہے۔ سوئٹزرلینڈ ایک چھوٹا سا پہاڑی ملک ہے جس کے پاس کوئی قابل ذکر مادی وسائل موجود نہیں لیکن وہ گھڑیوں کی صنعت، بینکنگ اور دواسازی میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کے برعکس مشرق وسطیٰ کے بیشتر ممالک تیل اور دیگر معدنیات سے مالا مال ہیں لیکن پھر بھی پس ماندہ ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ان ممالک میں اُن ملکوں کی طرح ایسے انسانی وسائل موجود نہیں ہیں جو اپنے ملک کو اقتصادی ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچہ فراہم کر سکیں کیونکہ مقامی لوگ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ضروری مہارتوں سے عاری ہیں اس لیے تمام ترقیاتی اور تعمیراتی کاموں کے لیے ضروری تعلیمی پس منظر رکھنے والی تربیت یافتہ افرادی قوت کو درآمد کیا گیا ہے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ افرادی قوت کے بغیر انسانی وسائل سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور انسانی وسائل کو صرف تعلیم کے ذریعے ہی ترقی دی جا سکتی ہے۔ تعلیم ہی سے لوگوں کو ایسی مہارتیں سکھائی جا سکتی ہیں جو ملکی معیشت کو بہتر بناتی اور ترقی دیتی ہیں۔ اسی لیے تعلیم کو آج کے دور میں بالکل صحیح طور پر سب سے زیادہ اہم سرمایہ کاری تصور کیا جاتا ہے۔

پاکستان کا شمار ابھی تک ترقی پذیر ممالک کی صف میں ہی ہوتا ہے۔ ملک کا معاشرتی ڈھانچہ ملک کی معاشی ترقی کے لیے ضروری بنیادیں فراہم نہیں کر پا رہا۔ ملکی معیشت کو بہتر بنانے اور لوگوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں معاشرتی، نسلی، علاقائی اور مذہبی ہم آہنگی ہو جو صرف اور صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ قومی یکجہتی کے بغیر سماجی اور اقتصادی ترقی کا خواب ادھورا ہی رہتا ہے۔ لہٰذا معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلیاں لائے بغیر ہم اپنے ہاں سے غربت، بھوک، بیماری اور جہالت کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے لوگوں کی سوچ اور رویوں کو بدلنا ہوگا جو صرف اور صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لہٰذا تعلیم ہی بالواسطہ معاشی طور پر فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

تعلیم کو عام کرنے کے لیے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یونیسکو کی سفارشات کے مطابق ترقی پذیر ممالک کو مجموعی قومی آمدنی کا کم از کم 4 فیصد تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے کیونکہ یہی سرمایہ کاری ملک کی اقتصادی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستان میں اقوام متحدہ کی تحقیقات کے مطابق حقیقی شرح خواندگی ابھی بہت زیادہ نہیں ہے جبکہ اس میں اضافے کے لیے مزید سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ تعلیم میں سرمایہ کاری سے لوگوں میں شرح خواندگی بڑھے گی جو لوگوں کی سوچ اور رویوں میں تبدیلی کا باعث ہوگی جس

سے قومی یکجہتی کا شعور بیدار ہوگا۔ جمہوری اقدار کو فروغ ملے گا اور ملک کو سیاسی استحکام حاصل ہوگا جس کے نتیجے میں ملک معاشی طور پر ترقی کرے گا۔

تعلیمی اداروں میں طبعی سہولیات کی صورت حال

(Physical Conditions of Educational Institutions)

خواندگی کو بڑھانے، ترک مدرسہ کو کم کرنے اور ملک میں تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیے تعلیم کے شعبہ میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی واضح اور سادہ سی بات ہے کہ ہم تعلیم کو جس قدر پُرکشش بنائیں گے لوگ اس کے حصول کی طرف زیادہ مائل ہوں گے۔ تعلیمی ماحول میں بہتری سے ہی تعلیمی معیار بہتر ہوگا۔ اگر تعلیمی اداروں میں تعلیم دینے کے لیے درکار ضروری وسائل اور سہولتیں ہی دستیاب نہیں ہوں گی تو ہم اپنے تعلیمی معیار میں کس طرح بہتری اور ترقی کا سوچ سکتے ہیں۔ حکومت کوشش کر رہی ہے لیکن مسائل کے مقابلے میں وسائل کی زیادتی کے باعث مسئلہ پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ ہماری آبادی 19 کروڑ سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ نئے تعلیمی ادارے کھولنے کے باوجود سکول جانے والے عمر کے بچوں کی ایک بڑی تعداد سکولوں سے باہر ہے۔ یا تو ان کے لیے سکول موجود نہیں یا پھر ان اداروں میں بچوں کی تعلیم کے لیے ضروری سہولتیں موجود نہیں۔ بعض سکولوں کی عمارتوں پر لوگوں نے قبضہ کیا ہوا ہے اور وہاں تعلیمی عمل منقطع ہے۔ بعض سکول بالکل بند ہیں اور بعض ایسے ہیں جہاں تعلیمی عمل تو جاری ہے لیکن بنیادی تعلیمی سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔ مختلف تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سکولوں میں بنیادی تعلیمی سہولیات کی کمی، تعلیمی اخراجات اور صنفی امتیاز ملک کی تعلیمی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں اور اساتذہ کی تعداد سے بھی ملک کی تعلیمی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ملک یا معاشرہ کس حد تک تعلیمی ترقی یا پستی کا شکار ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ملک کے سکولوں اور اُن میں کام کرنے والے اساتذہ کی تعداد کا ایک جائزہ بھی تعلیمی اداروں میں طبعی سہولیات کی صورت حال اور مسائل کو سمجھنے میں معاون ہوسکتا ہے۔ آج بھی ہمارے تعلیمی اداروں میں طلبہ کے تناسب اور مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے ضرورت کے مطابق اساتذہ کی تعداد کم ہے جبکہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بھی صورت حال کوئی زیادہ اچھی نہیں ہے۔

معاشی اور معاشرتی حالات (Social & Economic Conditions)

معاشرے میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے سماجی تربیت بہت ضروری ہے۔ معاشرے کی اقدار، رسم و رواج اُن کی پابندی فرد اور معاشرہ دونوں کیلیے اہم ہوتی ہے لیکن کوئی بھی فرد ان اقدار پر اُسی وقت کاربند ہوگا جب معاشرے میں اُن اقدار کو کوئی اہمیت دی جاتی ہوگی۔ جن اداروں اور اقدار کو معاشرہ اہمیت نہ دے اس میں کام کرنے والے افراد اور اُن کے کام کو بھی معاشرہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

ایک تعلیمی ادارے کے عناصر ترکیبی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ایک مکمل سماج ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بڑے سماج یا معاشرہ کے مقابلے میں یہاں افراد کی تعداد کم اور وسائل و مسائل نسبتاً محدود ہیں۔ یہاں آنے والے بچے مختلف گھروں سے آتے ہیں اور جُدا جُدا پس منظر کے حامل ہوتے ہیں۔ اُن کا ذہنی، سماجی اور اخلاقی پس منظر ایک دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بچے تعلیم میں دلچسپی لیتے ہیں اور بعض تعلیم سے دور بھاگتے ہیں۔

کسی بھی ملک اور معاشرے کے معاشی اور معاشرتی حالات اور پس منظر اُس کی ترقی اور معیارِ زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ معیارِ زندگی کا تعلق افراد کو حاصل صرف مادی اشیا، آسائشوں اور سہولتوں سے ہی نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں موجود سماجی ماحول اور ذہنی کیفیت سے بھی ہوتا ہے جو بظاہر تو نظر نہیں آتے لیکن معاشرے پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ ان میں، تعلیمی شرح خواندگی، آزادیٔ اظہار، فیصلہ سازی میں لوگوں کی شمولیت اور دیگر سماجی رویے اور اقدار شامل ہیں۔ پست معیارِ زندگی معاشی اور معاشرتی بدحالی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف جرائم اور افراتفری پھیلتی ہے بلکہ امن وامان اور معاشرتی سلامتی کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ جنوبی ایشیا دنیا کا غریب ترین خطہ ہے اور پاکستان بھی اسی خطے میں واقع ہے۔ اس خطے کے مسائل میں ناخواندگی، غربت اور خوراک کی کمی شامل ہیں لیکن اس کے باوجود ہم تعلیم اور صحت جیسے اہم شعبوں پر بہت کم رقم صرف کر رہے ہیں۔

کسی بھی ملک میں تعلیم کو فروغ تب ہی مل سکتا ہے جب اس کے لیے مطلوبہ مالی وسائل فراہم کیے جائیں تا کہ نئے سکول قائم ہوں۔ مزید اساتذہ کا تقرر ہو۔ بچے اور بچی اور بالغ مرد و عورت کو دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح مفت تعلیم فراہم کی جاسکے۔

ایک ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے پاکستان معاشی طور پر ابھی اس پوزیشن میں نہیں کہ تعلیم کے فروغ کے لیے تمام وسائل مہیا کر سکے۔ پاکستان کے نویں پانچ سالہ منصوبے 2003-1998 کے تحت طے شدہ تعلیمی اہداف حاصل کرنے کے لیے 144 ارب روپے کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا تھا لیکن مختلف وجوہات کے باعث یہ رقم فراہم نہیں کی جاسکی اور یوں تعلیمی ترقی کا خواب معاشی وسائل کی کمی کے باعث پورا نہ ہوسکا۔

تعلیمی ترقی میں ملک کے معاشی حالات کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر لوگوں کی معاشی حیثیت کا بھی براہ راست تعلق ہوتا ہے کہ اُن کی فی کس آمدنی کیا ہے؟ چین، جاپان، کوریا، ملائشیا، سنگاپور اور تھائی لینڈ جیسے ممالک میں لوگوں کی فی کس آمدنی آج سے 30 سال پہلے پاکستان کی فی کس آمدنی کے برابر تھی لیکن آج یہ شرح پاکستان کی نسبت 27 گنا زیادہ ہوچکی اور معیارِ زندگی دوگنا ہو چکا ہے جبکہ انسانی ترقی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے 175 ممالک میں سے 138 نمبر پر ہے۔

معاشی صورت حال کی بین الاقوامی تعریف کے مطابق ایک ڈالر فی کس روزانہ کمانے والا شخص نہ صرف غریب بلکہ مفلس کہلاتا ہے اور خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ پاکستان میں ایسے افراد کی تعداد کل ملکی آبادی کا 35 فیصد کے قریب ہے۔ یعنی پاکستان کے قریباً 55 ملین لوگ بے حد غریب اور مفلس ہیں۔ پاکستان میں 16-2015ء میں غربت کی شرح قریباً 25 فیصد تھی جو اب بڑھتے بڑھتے 35 فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ تاہم حکومت کی (Poverty Reduction Strategy) غربت میں کمی کی پالیسی کے تحت اقدامات کے ذریعے اس پر قابو پانے کی کوششیں جاری ہیں۔

معاشرتی اعتبار سے پاکستان طبقاتی نظام کا شکار ہے۔ ایک طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جو غریب یا بے حد غریب ہیں۔ تعلیمی کمی اور ناخواندگی کے باعث مختلف رسم و رواج کا شکار ہے۔ 1951ء میں ملک میں ناخواندہ افراد کی تعداد 2 کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ گزشتہ 69 سال میں اگرچہ مجموعی شرح خواندگی میں اضافہ ضرور ہوا ہے لیکن آبادی میں اضافے کے باعث ناخواندہ افرد کی تعداد بڑھ کر ساڑھے پانچ کروڑ سے زائد ہوچکی ہے۔ اس طبقے میں غریب کنبوں میں افراد کی تعداد زیادہ اور آمدنی کم ہے۔ یہ لوگ روٹی، کپڑے، اور رہائش کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر پاتے اور یہ کہ وہ اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے بچے سکول جانے کی بجائے یا تو گلیوں میں کھیل کود کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں یا ان کو ورکشاپوں، ہوٹلوں، ویگنوں اور بسوں وغیرہ میں مزدوری کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کم عمر بچیوں کو بھی سکول میں داخل کروانے کی بجائے گھریلو کاموں میں لگا دیا جاتا ہے۔

پاکستان کے اسی طبقاتی نظام کے باعث دوسرا طبقہ ان امرا، جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں، صنعت کاروں اور نوکر شاہی کا ہے جو ایک طرف تو ملک کے زیادہ تر پیداواری وسائل پر قابض ہے اور دوسری طرف اپنے زیر اثر علاقوں اور لوگوں میں تعلیم عام کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ اپنے اثر ورسوخ اور اختیارات کی وجہ سے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے فروغ تعلیم کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے رہتے ہیں تا کہ معاشرے میں اُن کی بالادستی قائم رہ سکے۔

اہم نکات

1- کسی بھی قوم یا ملک کی ترقی کے لیے اس کے زیادہ سے زیادہ افراد کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔

2- خواندگی کی اصطلاح عام طور پر افراد کے پڑھنے لکھنے اور حساب کرنے کی ابتدائی صلاحیت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

3- اسلام نے کسی تفریق کے بغیر تعلیم کو عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں طور پر فرض قرار دیا ہے۔

4- پڑھی لکھی مائیں ہی اگلی نسلوں کی صحیح تعلیم وتربیت کر سکتی ہیں۔ اسی لیے انسان کی تمدنی زندگی میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

5- ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح بہت اچھی نہیں ہے لیکن عورتوں کی شرح خواندگی عمومی طور پر کم ہے۔

6- کسی بھی گھر، معاشرے یا ملک کو کامیابی سے چلانے کے لیے نظم وضبط ایک لازمی عنصر ہے۔

7- تعلیمی اداروں میں نظم وضبط سے مراد ہے کہ ان اداروں کے طے شدہ اصول وضوابط پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

8- بے ہنگم اور تیز رفتار اضافہ آبادی سے انفرادی اور قومی وسائل پر بوجھ بڑھ جاتا ہے۔

9- آبادی میں اضافے سے بہت سے معاشی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں خصوصاً تمام بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں فراہم نہیں کی جا سکتیں۔

10- کسی بھی ملک کے تعلیمی، معاشی اور معاشرتی حالات اس کی ترقی اور معیار زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

11- پاکستان میں تارک مدرسہ کی اصطلاح اُن بچوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو ابتدائی سطح کی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے سکول چھوڑ جاتے ہیں۔

12- کسی بھی معاشرے کی سوچ، رویے اور اقدار براہ راست تعلیم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

13- سماجی اور معاشی رویوں کے حوالے سے ہمارے ملک میں تعلیم کو وہ مقام حاصل نہیں جو اسے ہونا چاہیے۔

14- افراد کو ترقی دینے کے لیے تعلیم سب سے اہم اور بنیادی سرمایہ کاری ہے۔

15- کسی ملک کے انسانی وسائل جس قدر بہتر تعلیم یافتہ ہوں گے اُس قدر ہی ملک مستحکم اور مضبوط ہوگا۔

16- تعلیمی اداروں میں ضروری وسائل اور سہولتیں مہیا کرنے سے ہم تعلیمی معیار میں بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔

آزمائشی مشق

معروضی حصہ

I- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے سب سے موزوں ترین جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

1- یونیسکو UNESCO کے مطابق خواندگی:

ا۔ کسی بھی زبان میں سمجھ بوجھ کر کم از کم ایک پیراگراف کے پڑھنے، لکھنے اور بیان کرنے کو کہتے ہیں۔

ب۔ کسی بھی تحریر یا عبارت کو پڑھنے، لکھنے کو کہتے ہیں۔

ج۔ کسی بھی زبان میں چھپے ہوئے الفاظ پڑھنے اور ان کے مفہوم سمجھنے کی صلاحیت ہے۔

د۔ اخبار کو پڑھنے کی صلاحیت کو کہتے ہیں۔

2- کم شرح خواندگی کے باعث:

ا۔ ملک کی اقتصادی ترقی بھرپور انداز میں نہیں ہو پاتی۔

ب۔ ملکی سماجی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ج۔ ملک کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترقی رک جاتی ہے۔

د۔ ملک کی اقتصادی اور سماجی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

3- پاکستان میں 2016 کے اعداد و شمار کے مطابق شرح خواندگی:

ا۔ 45.7 فیصد تھی۔ ب۔ 51.6 فیصد تھی۔

ج۔ 59.2 فیصد تھی۔ د۔ 60 فیصد تھی۔

4- شرح خواندگی کے اعتبار سے پاکستان کی شرح خواندگی:

ا۔ بھوٹان اور بنگلہ دیش سے زیادہ ہے۔ ب۔ بھوٹان اور بنگلہ دیش سے کم ہے۔

ج۔ نیپال اور بھوٹان سے زیادہ ہے۔ د۔ نیپال اور بھوٹان سے کم ہے۔

5- پاکستان میں تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے:

ا۔ خواندگی میں اضافہ ضروری ہے۔ ب۔ یکساں نصاب تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔

ج۔ یکساں تعلیمی سہولتیں فراہم ہونا ضروری ہے۔ د۔ اُن کے تعلیمی اداروں میں اضافہ ضروری ہے۔

6- نظم و ضبط بنیادی طور پر:

ا۔ تکلیف دہ پابندیاں قبول کرنے کا عمل ہے۔

ب۔ کسی ادارے یا شخص کے قوانین کی پابندی کا عمل ہے۔

ج۔ اپنی مرضی کو مقرر شدہ اصولوں اور قوانین کے تابع کرنے کا عمل ہے۔

د۔ معاشرے کی جانب سے لوگوں کو قانون کا پابند کرنے کا عمل ہے۔

7- ناخواندہ افراد کی تعداد میں اضافے کا سب سے اہم سبب:

ا۔ ترکِ مدرسہ ہے۔ ب۔ تعلیم کے بارے میں لوگوں کا عمومی رویہ ہے۔

ج۔ آبادی میں تیز رفتار اضافہ ہے۔ د۔ سکولوں کی تعداد میں کمی ہے۔

8- پاکستان میں 2004 کے اعداد و شمار کے مطابق ابھی بھی:

ا۔ 40 ملین لوگ ناخواندہ ہیں۔ ب۔ 48 ملین لوگ ناخواندہ ہیں۔

ج۔ 55 ملین لوگ ناخواندہ ہیں۔ د۔ 50 ملین لوگ ناخواندہ ہیں۔

9- ہمارے معاشرے میں عموماً اور تعلیمی حلقوں میں خصوصاً خیال کیا جاتا ہے کہ:

ا۔ ہمارا معیارِ تعلیم پچھلے سالوں کی نسبت بہتر ہوا ہے۔ ب۔ ہمارا معیارِ تعلیم پچھلے سالوں کی نسبت زوال پذیر ہے۔

ج۔ ہمارا معیارِ تعلیم پچھلے سالوں جیسا ہی ہے۔ د۔ ہمارا معیارِ تعلیم تسلی بخش ہے۔

10- تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے اس لیے تعلیمی ادارے دراصل:

ا۔ معاشرتی ادارے ہی ہیں۔ ب۔ معاشی ادارے ہیں۔

ج۔ معاشی اور معاشرتی ادارے ہیں۔ د۔ تعلیمی، معاشی اور معاشرتی ادارے ہیں۔

11- بری معاشی حالت اور سہولتوں سے محروم لوگ تعلیم کو:

ا۔ سرمایہ کاری تصور کرتے ہیں۔ ب۔ سرمایہ داری تصور کرتے ہیں۔

ج۔ قومی بچت تصور کرتے ہیں۔ د۔ اسراف خیال کرتے ہیں۔

12- پاکستان کے معاشرے میں عددی اعتبار سے سب سے بڑا طبقہ:

ا۔ جاگیرداروں کا ہے۔ ب۔ سرمایہ داروں کا ہے۔

ج۔ متوسط لوگوں کا ہے۔ د۔ غریب لوگوں کا ہے۔

13- زیادہ تر کس طبقہ کے لوگ تعلیم کو سرمایہ کاری تصور کرتے ہیں:

ا۔ جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ ب۔ تاجر اور صنعت کار طبقہ

ج۔ متوسط طبقہ د۔ غریب طبقہ

II- درج ذیل جملوں میں خالی جگہ کو مناسب الفاظ سے پُر کیجیے:

i- انسان کی تمدنی زندگی کا ارتقا............اور مرد کے باہمی اشتراک سے ہی ممکن ہے۔

ii- ماں کی گود بچے کی تعلیم کا اہم اور............گہوارہ ہے۔

iii- اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں مردوں اور عورتوں کے لیے............حقوق دیے گئے ہیں۔

iv- ذرائع ابلاغ اور تعلیم کی............کے باعث لوگوں کے رویوں میں مثبت تبدیلی آئی ہے۔

v- زندگی کے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں کامیابی کے لیے............بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

vi- وہ تمام سرگرمیاں جو معاشی اقدار اور سماجی اصولوں سے............نہ رکھیں نظم و نسق کے فقدان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

vii- پاکستان کی قریباً تمام سیاسی جماعتوں نے اساتذہ اور طلبہ میں اپنی .... قائم کر رکھی ہیں۔

viii- اضافہ آبادی سے ملکی .... پر دباؤ بڑھتا ہے۔

ix- معیارِ تعلیم کا فیصلہ تعلیم کے ہندسی اور .... جائزے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔

x- معیارِ تعلیم نظامِ تعلیم کی کارکردگی کا جائزہ لینے کی ایک .... ہے۔

xi- تعلیمی اداروں کا قیام اور تعلیم کا انصرام کرنا براہِ راست .... ہی کی ذمہ داری ہے۔

xii- پاکستان کی قریباً .... فیصد آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔

xiii- عموماً غریب اور نچلے طبقے کے لوگ تعلیم حاصل کرنے کو وقت کا .... تصور کرتے ہیں۔

xiv- پاکستان کے بعض علاقوں میں تعلیم دلوانے کے سلسلے میں لڑکوں کو لڑکیوں پر .... دی جاتی ہے۔

xv- پاکستان میں معاشی اور معاشرتی اعتبار سے استاد .... درجے پر ہے۔

xvi- تمام ماہرینِ تعلیم و معاشیاتِ تعلیم کی .... افادیت کے ہمیشہ سے قائل رہے ہیں۔

xvii- فرانس میں صنعتی انقلاب کا باعث .... کا زیادہ ہونا تھا۔

xviii- انسانی وسائل کو صرف .... ہی کے ذریعے ترقی دی جا سکتی ہے۔

انشائیہ حصہ

III- خواندگی سے کیا مراد ہے؟ پاکستان میں خواندگی کی صورتِ حال کی وضاحت کریں اور خطے کے ممالک سے اس کا موازنہ کریں۔

IV- کسی بھی معاشرے کے لیے تعلیمِ نسواں کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحت کریں۔ نیز پاکستان میں تعلیمِ نسواں کی صورتِ حال پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

V- نظم و ضبط کے تصور اور اہمیت کی وضاحت کریں۔ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں نظم و ضبط کی کمی کے اسباب پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

VI- پاکستان میں آبادی کی صورتِ حال کی وضاحت کریں اور آبادی میں اضافے سے پیدا ہونے والے اثرات اور ان کے تعلیم سے تعلق کی وضاحت کریں۔

VII- معیارِ تعلیم سے ہم کیا مراد لیتے ہیں؟ معیارِ تعلیم پر اثر انداز ہونے والے عوامل پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

VIII- ترکِ مدرسہ کے تصور کی وضاحت کریں۔ پاکستان میں بچوں کے تعلیم ترک کرنے میں کون سے عوامل کارفرما ہیں؟ تفصیل لکھیں۔

IX- پاکستان کے لوگوں کے تعلیم کے بارے میں عمومی رویے پر تفصیلی نوٹ لکھیں جس سے پاکستانی معاشرے کی سوچ کی حقیقی عکاسی ہو۔

X- تعلیم میں سرمایہ کاری کی کیا اہمیت ہے؟ انسانی اور اقتصادی وسائل تعلیم کے مسائل کو حل کرنے میں کس طرح معاون ہو سکتے ہیں؟

XI- پاکستان کے تعلیمی اداروں میں موجود طبعی سہولیات کی صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ لیں اور اس سلسلہ میں حکومتی سطح پر کیے جانے والے اقدامات کی وضاحت کریں۔

XII- کسی بھی معاشرے کے معاشی اور معاشرتی حالات کس طرح تعلیم پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ مخصوص مثالوں سے وضاحت کریں۔

پانچواں باب

تعلیم کے فروغ کے لیے مختلف تنظیموں کا کردار

(Role of Various Organizations Contributing towards Education)

تعلیمی انتظام وانصرام (Educational Administration)

ملک میں ضرورت کے مطابق نئے تعلیمی اداروں کے قیام، نصاب سازی، تربیت اساتذہ، امتحان اور جائزہ جیسے امور کی انجام دہی وفاقی، صوبائی اور ضلعی حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ اسی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے حکومتیں مختلف ادارے قائم کرتی ہیں جو مختلف سطحوں پر اور مختلف پہلوؤں سے فروغ تعلیم کے عمل میں حکومتوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں مثلاً وفاقی اور صوبائی محکمہ ہائے تعلیم، امتحانی بورڈز اور ٹیکسٹ بک بورڈز وغیرہ۔

صوبائی محکمہ تعلیم (Provincial Department of Education)

اگرچہ ملک کے مجموعی تعلیمی نظام کی نگرانی وفاقی حکومت کرتی ہے لیکن مرکز میں بیٹھ کر سارے ملک کے تعلیمی انتظام وانصرام اور صوبائی ضروریات و معاملات کو سمجھنا اور ان کے مسائل کو فوری حل کرنا وفاقی وزارت کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے صوبائی سطح پر محکمہ تعلیم صوبوں میں تعلیمی تنظیم وترقی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یوں بھی تعلیم صوبائی محکموں کی ذمہ داری میں شامل ہے۔

صوبائی محکمہ تعلیم کا سربراہ وزیر تعلیم ہوتا ہے۔ اس کے بعد صوبائی سیکرٹری تعلیم کا درجہ ہوتا ہے۔ صوبائی سیکرٹری تعلیم کے اختیارات وفرائض کم وبیش وہی ہیں جو وفاقی سیکرٹری تعلیم کے ہوتے ہیں۔ صوبائی سیکرٹری وفاقی سیکرٹری سے رہنمائی وہدایت حاصل کرتا ہے۔ جس طرح مرکزی وزارت تعلیم کے مختلف شعبے ہیں اور ان میں افسران وماتحت عملہ متعین ہے۔ اس طرح صوبوں میں بھی محکمہ تعلیم کے مختلف شعبے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اہم شعبوں کی فہرست درج ذیل ہے:-

1۔ ڈائریکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشن۔

2۔ ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفس (تعلیم)۔

3۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ / فنی تعلیمی بورڈ۔

4۔ ادارہ تدوین نصاب وتوسیع تعلیم / ادارہ ترقی نصاب وتحقیق۔

5۔ صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈ۔

صوبائی محکمہ تعلیم کی ذمہ داریاں وفرائض اور اختیارات

1۔ قومی تعلیمی پالیسی پر عمل اور تعلیمی ضروریات کا جائزہ لینا

وفاقی حکومت قومی تعلیمی پالیسی مرتب کرتی ہے جبکہ صوبائی محکمہ تعلیم اپنے صوبے میں اس پالیسی پر عملدرآمد کروانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ صوبائی محکمہ تعلیم اپنے صوبے کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لیتا ہے اور تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے مختلف منصوبوں کی منظوری دیتا ہے۔

2۔ ملازمت کے قواعد مرتب کرنا

صوبائی محکمہ تعلیم میں اعلیٰ افسران کا تقرر، تبادلے اور ملازمت سے متعلق دوسرے تمام امور کی نگرانی کرنا صوبائی محکمہ تعلیم کی ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ سکولوں کے اساتذہ کا چناؤ، ان کی شرائط ملازمت، ملازمت کا تعین وتقرری وتبادلہ اور ملازمت کے قواعد مرتب کرنا بھی صوبائی محکمہ تعلیم ہی کی ذمہ داری ہے۔

3۔ تعلیمی اداروں اور انتظامی معاملات کی نگرانی کرنا

صوبے میں محکمہ تعلیم کا ایک انتظامی شعبہ ہوتا ہے۔ انتظامی معاملات درپیش ہوتے ہیں، ان کی نگرانی اور اصلاح بھی صوبائی محکمہ تعلیم کا فرض ہے جو صوبے میں قائم تعلیمی شعبوں اور اداروں کے انتظامی اور تعلیمی امور کی نگرانی اور اصلاح کا کام کرتا ہے۔ ان اداروں میں پرائمری تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے عام اور پیشہ ورانہ تعلیم کے ادارے شامل ہیں۔ ان کے تعلیمی معیار، تعلیمی ضروریات، اخراجات اور تقاضوں کو سمجھنا اور ان کی مناسب دیکھ بھال کرنا صوبائی محکمہ تعلیم کا فرض ہے۔ ملک میں شرح خواندگی میں اضافے کے لیے تعلیم بالغاں کے مؤثر پروگرام ضروری ہیں۔ مرکزی سطح پر خواندگی کمیشن قائم ہے لیکن صوبوں میں محکمہ تعلیم کے تعاون سے تعلیم بالغاں کے پروگراموں کو مؤثر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

4۔ تعلیمی بجٹ اور منصوبے تیار کرنا

محکمہ تعلیم کے مختلف شعبوں سے متعلق تمام اخراجات کا میزانیہ تیار کرنا، ساز وسامان کی خریداری اور اس کے حصول کے لیے منظوری دینا نیز مالی امور کی نگرانی کرنا صوبائی محکمہ تعلیم کی ذمہ داری ہے۔ علاوہ ازیں مختلف تعلیمی منصوبوں کی تیاری، منظوری، نگرانی اور تکمیل بھی اس محکمہ ہی کے سپرد ہے۔ یہی محکمہ صوبے میں تعلیم سے متعلق اعداد وشمار بھی جمع کرتا ہے تاکہ تعلیم کی ترقی اور تحقیق میں ان سے مدد مل سکے۔

5۔ تدوین نصاب

صوبائی محکمہ تعلیم کی ذمہ داری ہے کہ تعلیمی پالیسی کے مطابق نصاب کی تشکیل وتدوین میں اپنا کردار ادا کرے۔ صوبائی محکمہ تعلیم نصاب کی کمیٹیوں اور ادارہ توسیع نصاب کی مدد سے یہ ذمہ داری پوری کرتا ہے اور درسی کتب کی تیاری کی نگرانی کرتا ہے۔

6- تعلیمی وظائف کے لیے سفارشات کرنا

اگرچہ بیرون ملک تعلیمی وفود بھیجنا اور اساتذہ وطلبہ کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف مہیا کرنا وفاقی وزارتِ تعلیم کی ذمہ داری ہے لیکن صوبائی سطح سے اس مقصد کے لیے اساتذہ اور طلبہ کا چناؤ اور نامزدگیاں کرنا محکمہ تعلیم ہی کی ذمہ داری ہے۔

7- تعلیمی کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انعقاد

صوبے میں معیار تعلیم بلند کرنے، تعلیمی اصلاحات کے نافذ کرنے، تعلیمی تقاضوں اور ضروریات کا جائزہ لینے، انھیں جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے، تحقیقات کے نتائج کی روشنی میں تبدیلیاں کرنے اور تجاویز وسفارشات پیش کرنے کے لیے تعلیمی کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ جن میں اندرون ملک اور بیرون ملک ماہرین تعلیم اور نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

8- خودمختار و نیم خودمختار اداروں کی نگرانی کرنا

تعلیم کے فروغ کے لئے صوبے میں مختلف خودمختار اور نیم خودمختار ادارے کام کرتے ہیں۔ان میں ٹیکسٹ بک بورڈ، امتحانی تعلیمی بورڈز، نظامت تعلیمات، یونیورسٹیاں، تدوین نصاب و تحقیق کے ادارے اور تربیتِ اساتذہ کے ادارے شامل ہیں۔صوبائی محکمہ تعلیم ان اداروں کے معاملات کی نگرانی کرتا ہے اور ان کے مسائل حل کرنے میں تعاون کرتا ہے۔

صوبائی محکمہ تعلیم میں سیکرٹری تعلیم کی معاونت کے لیے سپیشل سیکرٹری تعلیم (سکولز) اور سپیشل سیکرٹری (اعلیٰ تعلیم) کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ صوبائی سطح پر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (سکولز) اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (کالجز) بھی کام کرتے ہیں۔

پرائیویٹ تنظیمیں (Private Sector Organizations)

پاکستان میں پہلی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک کی درسی کتب کی قومی نصاب تعلیم کے مطابق تیاری حکومتی ذمہ داری ہے۔ حکومت صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈز کی مدد سے طلبہ کے لیے درسی کتب کی فراہمی کا بندوبست کرتی ہے۔ نصاب سازی کے عمل سے لے کر کتابوں کی تیاری اور پھر انھیں طلبہ تک پہنچانے کے لیے سرکاری اداروں اور افراد کے ساتھ غیر سرکاری ادارے اور افراد بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ثانوی اور انٹرمیڈیٹ سطح کے امتحانات تعلیمی بورڈ لیتا ہے۔ جن کے لیے قومی تعلیمی نصاب کے مطابق سرکاری اور پرائیویٹ سکولوں کے طلبہ کے لیے ٹیکسٹ بک بورڈز مختلف مضامین کی کتب فراہم کرتے ہیں۔ یوں سرکاری اور غیر سرکاری سکولوں میں ان تمام امتحانات کے لیے جو تعلیمی بورڈز لیتے ہیں ایک ہی طرح کی کتب استعمال کی جاتی ہیں جو متعلقہ ٹیکسٹ بک بورڈ چھاپتے اور فراہم کرتے ہیں۔

اگرچہ پانچویں اور آٹھویں کلاس کے امتحانات کا انعقاد حکومت کی طرف سے ضلعی سطح پر کیا جاتا ہے لیکن تمام طلبہ کے لیے اس میں شرکت کرنا لازمی نہیں ہے، اس لیے پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک کے امتحانات سکولوں کی اپنی ذمہ داری ہیں۔ خواہ سرکاری ہو یا پرائیویٹ ہر سکول داخلی طور پر ان کلاسوں کے امتحانات کا انعقاد کرتا ہے تاکہ طلبہ کو اگلی جماعتوں میں ترقی دی جا سکے۔ اس لیے ان سکولوں کے امتحانات میں معیار اور نصاب کی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ سرکاری سکولوں میں پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک یکساں نصاب اور درسی کتب کو استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس سطح کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے الگ الگ اداروں کی شائع کردہ کتب استعمال کرتے ہیں۔ بسا اوقات یہ کتب مضمون وار سیریز کی صورت میں ہوتی ہیں۔ ہر سکول اپنی ضرورت اور سکول میں زیرِ تعلیم طلبہ اور ان کے والدین کی خواہشات کے مطابق سرکاری یا پرائیویٹ اشاعتی اداروں کی تیار کردہ درسی کتب استعمال کرتا ہے۔ زیادہ نمایاں اشاعتی اداروں میں فیروز سنز، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، رہبر پبلشرز اور پیراماؤنٹ پبلشرز وغیرہ شامل ہیں۔

ضلعی سطح پر تعلیمی انتظام (Educational Management at District Level)

حکومت پاکستان نے 2001ء سے ملک کے انتظامی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں کی تھیں۔ دیگر تمام شعبوں کی طرح تعلیم کے متعلق انتظامی امور میں بھی بعض ضروری تبدیلیاں کی گئیں۔ حکومت نے صوبوں میں قائم انتظامی ڈویژن ختم کر دیے ہیں اور بہت سے انتظامی اختیارات صوبائی اور ڈویژن کی سطح سے ضلعی اور تحصیل کی سطح پر منتقل کر دیے گئے۔ تعلیم کے شعبہ میں بھی حکومت کے اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کے منصوبے (Devolution of Power Plan) کے تحت یہ عمل جاری رہا اور ڈویژن کی سطح پر

قائم ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ آف سکولز اور ڈائریکٹوریٹ آف کالجز ختم کر دیے گئے اور یہ اختیارات بلدیاتی انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی ضلعی حکومتوں کے سپرد کر دیے گئے۔ اس طرح عوام کے ووٹوں سے منتخب نمائندوں کو انتظامی امور کا ذمہ دار بنایا گیا۔ لیکن حال ہی میں حکومت کے فیصلے کے مطابق جولائی 2006ء سے کالج کی سطح کی تعلیم ضلعی حکومتوں سے واپس لے کر صوبائی حکومت کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اب ضلعی سطح پر کالج کی تعلیم صوبائی حکومت کی ذمہ داری ہوگی اور ضلع میں کالج کے معاملات کے بارے میں تعینات آفیسر صوبائی حکومت کو جوابدہ ہوگا۔

ضلعی ناظم اپنے ضلع میں صوبائی اور وفاقی حکومتوں کی تعلیمی پالیسیوں اور فیصلوں پر عملدرآمد کروانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی مدد کے لیے ڈسٹرکٹ کوآرڈینیشن آفیسر (DCO) کا عہدہ قائم کیا گیا ہے۔ جس کے ماتحت مختلف محکموں کے ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسرز کام کرتے ہیں۔ ضلع کے تعلیمی امور کی نگرانی اور انتظامات کی ذمہ داری ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر تعلیم (E.D.O.Education) کے سپرد ہے۔ ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر تعلیم (E.D.O Education) کی مدد کے لیے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسرز (DEO's) کی تقرری کی جاتی ہے۔ ان کی تعداد عموماً تین ہوتی ہے جو اس طرح سے ہوتی ہے۔

i- ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (ابتدائی تعلیم) DEO(Elementary Education)

ii- ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (ثانوی تعلیم) DEO(Secondary Education)

iii- ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (کالجز) DEO (Colleges)

"تعلیم سب کے لیے" (Education for All) کے منصوبے کے تحت ہر ضلع میں ایک ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر (خواندگی) (EDO Literacy) کا عہدہ بھی قائم کیا گیا ہے جو اپنے اپنے ضلع میں خواندگی کو عام کرنے اور سکول سے باہر پانچ سے سولہ سال کی عمر رکھنے والے ہر ناخواندہ بچے کو خواندہ بنانے اور تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی مدد کے لیے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسرز اور اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر (خواندگی) کا تقرر کیا گیا ہے۔

تمام ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسرز کو تعلیمی منصوبہ بندی، انتظامی اور نگرانی کے امور میں مدد دینے کے لیے ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسرز اور اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسرز متعین ہیں جو ضلع، تحصیل اور مقامی سطح پر ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر تعلیم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہر ضلع میں تعلیمی اداروں، طلبہ اور اساتذہ کی تعداد کی مطابقت سے ان کی پوسٹوں اور تعداد کا تعین کیا جاتا ہے۔ بعض بڑے اضلاع میں خواتین اور مرد اساتذہ کے متعلق انتظامی امور کو نپٹانے کے لیے زنانہ اور مردانہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسرز کام کرتے ہیں۔ ہر ایجوکیشن آفیسر اور ایگزیکٹو آفیسر کے لیے انتظامی امور سے مناسب طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے دفتری عملے کا تقرر بھی کیا گیا ہے جہاں ضرورت کے مطابق پوسٹوں کی تعداد میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔

یونیورسٹیوں کی تعلیم (University Education)

ملک میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں ان یونیورسٹیوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ یونیورسٹیاں بنیادی طور پر خود مختار تعلیمی ادارے ہیں جو تعلیمی اور انتظامی امور میں فیصلے کرنے کے حوالے سے اپنی پالیسی مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ ادارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں۔ زراعت، میڈیسن، میڈیکل، انجینئرنگ، قانون، تعلیم، سائنسی اور عمومی علوم میں اعلیٰ تعلیم انھیں اداروں میں دی جاتی ہے۔ تمام اعلیٰ قسم کی پیشہ ورانہ فنی تعلیم کی ذمہ داری یہی ادارے پوری کرتے ہیں، نئے علوم و نظریات پر کام اور علمی اور پیشہ ورانہ تحقیقات کرنا بھی یونیورسٹیوں کے ذمہ ہے۔

قومی اور نظریاتی اُمور میں تمام یونیورسٹیاں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی پالیسیوں کی پابند ہیں۔ ہر صوبے کا گورنر اپنے صوبے میں قائم پبلک یونیورسٹیوں کا چانسلر (Chancelor) ہوتا ہے جب کہ صوبائی وزیر تعلیم عہدے کے اعتبار سے صوبائی یونیورسٹیوں کا پروچانسلر (Prochancelor) ہوتا ہے۔ صوبائی محکمہ تعلیم کا یونیورسٹیوں کے امور سے زیادہ عمل دخل نہیں ہوتا جبکہ یونیورسٹیوں کے تعلیمی اور مالی معاملات کی نگرانی، رہنمائی اور مدد کے لیے وفاقی سطح پر ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) قائم کیا گیا ہے۔ یہ کمیشن اپنے چیئرمین کی نگرانی میں حکومت کی پالیسی کے مطابق یونیورسٹیوں کو مختلف تعلیمی منصوبوں اور تحقیقات کے لیے فنڈ مہیا کرتا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف فراہم کرنا بھی اسی کمیشن کے فرائض میں شامل ہے۔ اس کمیشن کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کو بین الاقوامی معیار پر لانے میں ان کی رہنمائی کرے اور یونیورسٹیوں کے مختلف تعلیمی اور تحقیقی پروگراموں میں معیار کی یکسانیت کو برقرار رکھنے کے لیے اقدامات کرے۔

یونیورسٹی کی سطح پر انتظامی اور تعلیمی امور کی نگرانی کے فرائض ادا کرنا وائس چانسلر (Vice Chancelor) کی ذمہ داری ہے۔ وائس چانسلر کی معاونت کے لیے ہر یونیورسٹی میں سنڈیکیٹ اور سینٹ قائم کی گئی ہیں جن میں ماہرین تعلیم، یونیورسٹی اساتذہ، مقننہ، عدلیہ اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے نمائندے اور ماہرین شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی انتظامی اور مالی امور میں معاونت کے لیے کنٹرولر امتحانات، رجسٹرار اور خازن ہوتے ہیں جو اپنے اپنے شعبوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ کنٹرولر امتحانات، رجسٹرار اور خازن کی مدد کے لیے متعدد ڈپٹی اور اسسٹنٹ کنٹرولر امتحانات، ڈپٹی اور اسسٹنٹ رجسٹرار، نائب خازن اور اسسٹنٹ خازن کام کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی امور کی نگرانی کے لیے مختلف ڈین اور تمام تعلیمی شعبوں کے سربراہ بھی اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ تعلیمی معاملات کی دیکھ بھال اور وائس چانسلر کی مدد اور رہنمائی کے لیے یونیورسٹیوں میں بورڈ آف سٹڈیز، بورڈ آف ہائر سٹڈیز اینڈ ریسرچ، اکیڈیمک کونسل اور مختلف کمیٹیوں کا قیام بھی عمل میں لایا جاتا ہے۔

نصاب اور تدریسی مواد (Curriculum and Textual Material)

کسی بھی نظام کی کامیابی کا یقین اس بات سے ہوتا ہے کہ متعلقہ نظام کس حد تک اپنے طے شدہ مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوا ہے۔ یہی بات نظام تعلیم کے لیے بھی درست ہے کہ کسی ملک یا معاشرے کے نظام تعلیم نے کس حد تک ملکی اور قومی مقاصد تعلیم حاصل کیے ہیں۔ بنیادی طور پر تعلیم کا مقصد معاشرتی زندگی کی تشکیل نو، تہذیبی ورثے کا تحفظ اور اس کی اگلی نسل تک منتقلی ہے۔ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنا بھی تعلیم کے مقاصد میں شامل ہے۔ ان مقاصد کا کامیاب حصول اس امر کا متقاضی ہے کہ نظام تعلیم کے تمام پہلوؤں پر یکساں اور بھرپور توجہ دی جائے۔

نصاب تعلیم مقاصد تعلیم کے حصول کا اہم ذریعہ، نظام تعلیم کا اہم اور بنیادی عنصر ہے۔ تمام علمی اور فنی تصورات و تجربات، جملہ ادبی معاشرتی اور تفریحی لوازمات نصاب ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں کتب و رسائل اور مختلف جرائد کا استعمال تعلیمی مقاصد کے حصول کو ممکن بنانے کے لئے ہی کیا جاتا ہے۔ نصاب اور اس سے متعلق درسی مواد کے انتخاب، تنظیم اور تیاری کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کے لیے طے شدہ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے، پھر تعلیم سے متعلق حقائق کا ادراک کرتے ہوئے طلبہ کی ذہنی استعداد، ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کے نظریۂ حیات، قومی اور معاشی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ تمام تعلیمی سرگرمیاں اور مواد نصاب ہی کا حصہ ہوتے ہیں اور طلبہ کی سہولت کے پیش نظر درسی، امدادی یا اضافی کتب کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ کتب دراصل دنیا

بھر میں ہر جگہ طلبہ کے لئے سب سے بڑے اور اہم وسیلہ تعلیم اور بنیادی آلہ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ پاکستان میں تعلیمی نصاب اور درسی کتب کی تدوین اور تیاری کے لئے مرکزی اور صوبائی سطح پر مختلف ادارے کام کر رہے ہیں۔ جن میں وفاقی سطح پر قومی شعبہ تدوین نصاب اور صوبائی سطح پر تدوین نصاب کے بیورو قائم ہیں۔ جبکہ درسی کتب کی تیاری کے لیے صوبے کی سطح پر ٹیکسٹ بک بورڈ مصروف عمل ہیں۔ ان کے علاوہ پرائیویٹ ادارے اور تنظیمیں بھی تعلیم کے فروغ کے لئے حوالہ جاتی، درسی امدادی اور اضافی کتب کے ساتھ تعلیمی رسائل و جرائد اور تدریسی مواد کی تیاری میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان سب کا مختصر تعارف اگلے صفحات میں پیش ہے۔

شعبہ تدوین نصاب وفاقی وزارت تعلیم (Curriculum Wing Ministry of Education)

ملک میں قومی سطح پر وفاقی وزارت تعلیم قائم ہے۔ اس وزارت کے تحت قومی شعبہ تدوین نصاب کام کر رہا ہے، اس شعبے کے اہم وظائف درج ذیل ہیں:۔

1- تعلیمی پالیسی مرتب کرنا اور نصابی یکسانیت میں صوبوں کی رہنمائی کرنا

نصاب سازی سے متعلق قومی تعلیمی پالیسی مرتب کرنا وفاقی حکومت اور صوبائی محکمہ تعلیم کو نصاب سے متعلق باخبر رکھنا اور اسے نافذ کروانا، اس شعبہ کی ذمہ داری ہے۔ قومی سطح پر پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک کی نصاب سازی کا کام یہی شعبہ سرانجام دیتا ہے۔ تدوین نصاب اور درسی کتب کی تیاری میں یکسانیت پیدا کرنا، صوبوں کو نصاب سازی کے لیے بنیادی پالیسی فراہم کرنا اور اس پر عملدرآمد میں مدد دینا اس شعبہ کے فرائض میں شامل ہے۔ ایسے صوبے جو نصابی معاملات اور درسی کتب کی تیاری میں دوسرے صوبوں سے پیچھے ہیں۔ ان کی مدد کر کے نصاب کی تکمیل اور نصابی کتب کی تدوین میں بھرپور کردار ادا کرنا اس شعبہ کے فرائض میں شامل ہے۔

2- دوسرے ممالک کے نصاب کا جائزہ

شعبہ تدوین نصاب کے فرائض میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے نصاب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا بھی شامل ہے تاکہ اس کی روشنی میں اپنے نصاب پر اپنی قومی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق نظر ثانی کی جاسکے کیونکہ کسی بھی دوسرے ملک کے نصاب کو جوں کا توں نہیں اپنایا جاسکتا۔

3- تمام مضامین کے نصاب کی تدوین

اس شعبہ کے ذمہ پہلی سے بارہویں جماعت کے نصاب کی تیاری کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کرنا، تحقیقی مقالے ترتیب دینا اور ان کے نتائج اور سفارشات کی اشاعت کرنا ہے تاکہ اساتذہ اور طلبہ، نصاب اور اس کی تیاری سے متعلق امور سے آگاہ ہو کر استفادہ کر سکیں۔

4- قومی مقاصد پر درسی کتب کو جانچنا

وفاقی شعبہ تدوین نصاب صوبائی مراکز تحقیق و تدوین نصاب کی رہنمائی کرتا ہے اور ٹیکسٹ بک بورڈز اور مصنفین کو درسی کتب لکھنے کے لئے رہنمائی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ ٹیکسٹ بکس، ورک بکس اور رہنمائے اساتذہ کی تدوین کر سکیں۔ درسی کتب کو قومی مقاصد

کی روشنی میں جانچ کروانے کے بعد ان کے مواد میں ترامیم اور اضافے کئے جاتے ہیں تا کہ درسی کتب، قومی تعلیمی مقاصد کے حصول میں بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

5- بین الاقوامی تعلیمی وثقافتی تعلقات کا فروغ

تعلیم کے فروغ کے لیے بین الاقوامی تعلیمی اداروں سے رابطہ قائم کرنا اور انہیں پاکستان میں تعلیم کے فروغ کے لئے کام کرنے کی ترغیب دینا، ان کے کام پر نظر رکھنا تا کہ قومی تعلیمی مفادات پورے ہوسکیں، بھی اس شعبے کی ذمہ داری ہے۔ بین الاقوامی اداروں مثلاً یونیسکو، یونیسف، ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک اور دیگر ایسے ہی اداروں کا تعاون حاصل کر کے ترقی یافتہ ممالک کے نصاب کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لے کر اپنے نصاب کو قومی اور بین الاقوامی تقاضوں کے مطابق بنا کر ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔

صوبائی بیوروز تدوین نصاب (Provincial Bureaus of Curriculum)

ملک میں تعلیم کے فروغ اور یکساں معیار تعلیم قائم رکھنے کے لئے صوبائی سطح پر تدوین نصاب و ترقی تحقیق / مرکز توسیع تعلیم کے ادارے قائم ہیں۔ صوبائی اداروں کے عملے کا تقرر صوبائی محکمہ تعلیم کرتا ہے جس کا عملہ صوبائی سیکرٹری تعلیم کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ ان اداروں کے سربراہ ڈائریکٹر کہلاتے ہیں اور ان کے تحت ڈپٹی ڈائریکٹر، دوسرے افسران اور ماہرین تعلیم اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ عملے کے اہم ارکان درج ذیل ہوتے ہیں:-

1- ڈپٹی ڈائریکٹر توسیع تعلیم / تحقیق، سکولوں کالجوں کے اساتذہ کی تربیت کے معاملات اور تدریسی معاملات پر تحقیق کے کام کے لیے ذمہ دار ہے۔

2- ڈپٹی ڈائریکٹر تدوین نصاب و تحقیق، صوبائی سطح پر نصاب کے بارے میں تحقیق اور اس کی تدوین کے معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔

3- مختلف مضامین کے ماہرین، اپنے اپنے مضامین کے نصاب اور اس کے ابلاغ کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے تحقیقی اور علمی کام سرانجام دیتے ہیں۔

4- دفتر کا دیگر عملہ، نصابی اور دفتری امور کی انجام دہی میں اپنے افسران کی مدد کرتا ہے۔

ان اداروں کی ذمہ داریاں وفرائض درج ذیل ہیں:-

i- وفاقی وزارت تعلیم کی ہدایات کے مطابق نصاب تعلیم مرتب کرنا، اس کو متوازن بنانا، اس کی درجہ بندی اور اصلاح کرنا۔

ii- دوسرے صوبوں کے مراکز نصاب سازی سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے مختلف مضامین کے تدریسی مقاصد و مواد میں یکسانیت پیدا کرنا تا کہ قومی مقاصد کا حصول ممکن بنایا جاسکے۔

iii- یونیسکو اور یونیسف کے مجوزہ پروگرامز کا انتظام کرنا اور ایسے پروگراموں میں رابطہ پیدا کرنا۔

iv- تیار شدہ نصابات کی جانچ کے لئے مختلف تعلیمی اور تحقیقی پروگرام تشکیل دینا تا کہ اصلاح اور تسلسل کا عمل قائم رہ سکے۔

v- تمام ٹیکسٹ بک بورڈز کو درسی کتب، ورک بکس اور دیگر ضروری کتب کی طباعت کے لیے تعاون فراہم کرنا۔

vi- زیر ملازمت اساتذہ کے لیے ورکشاپس اور ٹریننگ کورسز کا انتظام کرنا تا کہ وہ قومی شعبہ تدوین نصاب کی تیار کردہ ورک بکس، رہنمائے اساتذہ اور دیگر تعلیمی منصوبوں اور پروگراموں سے استفادہ کر سکیں۔

ٹیکسٹ بک بورڈ (Textbook Board)

ہر صوبے میں درسی کتابوں کی فراہمی کے لیے ٹیکسٹ بک بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ ادارہ قومی شعبہ تدوین نصاب کی سفارشات کے مطابق کتابیں تیار کراتا ہے۔ صوبے میں نصابی کتابوں کی تقسیم ٹیکسٹ بک بورڈ کے ذمے ہے۔ ٹیکسٹ بک بورڈ میں ماہرین تعلیم اور ماہرین مضمون مل کر قومی شعبہ تدوین نصاب کی سفارشات کے مطابق درسی کتب کی تصنیف و تالیف کرواتے ہیں۔

نصاب کے نفاذ کے مراحل

1۔ پہلا مرحلہ

نصاب سازی کی تکمیل کے بعد نصاب کے نفاذ کا مرحلہ آتا ہے۔ نفاذ میں پہلا مرحلہ قومی نصاب کے مطابق درسی کتب، رہنمائے اساتذہ اور دیگر مواد کی تیاری اور طباعت کا ہوتا ہے۔ اس میں قومی شعبہ تدوین نصاب، صوبائی نصاب بیورو، اور ٹیکسٹ بک بورڈ حصہ لیتے ہیں۔ ان کے باہمی اشتراک سے مندرجہ ذیل امور طے پاتے ہیں:۔

i- نصاب کی تیاری و طباعت

ii- مختلف مضامین اور درجوں کے لیے درسی کتب کی تیاری اور اشاعت

iii- اساتذہ کی رہنمائی کے لیے رہنمائے اساتذہ کی تیاری

iv- طلبہ کے لیے ورک بکس کی تیاری

2۔ دوسرا مرحلہ

نصاب کے نفاذ کا دوسرا مرحلہ نصاب کی تدریس کے لئے تدریسی طریقوں کا انتخاب، ضروری تدریسی معاونات کی تیاری اور ان کے مطابق اساتذہ کی تربیت کا ہے۔ اس کام میں وفاقی اور صوبائی مراکز تدوین نصاب، توسیع تعلیم کے مراکز، تعلیمی بورڈز، تعلیمی معاونات کی تیاری کے مراکز اور تربیت اساتذہ کے ادارے حصہ لیتے ہیں۔ ان کے باہمی اشتراک سے مندرجہ ذیل امور طے پاتے ہیں:۔

1- تعلیم و تربیت اساتذہ
2- تدریسی معاونات کی تیاری
3- ریفریشر کورس
4- تعلیمی سیمینار اور کانفرنسیں
5- جائزے کے کورس اور ورکشاپس

سٹاف ڈویلپمنٹ (Staff Development)

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ کوئی بھی ملک یا معاشرہ تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا۔ آج بھی دنیا میں وہی ممالک اور معاشرے ترقی یافتہ ہیں جن کو دیگر اقوام عالم پر علمی برتری حاصل ہے۔ یہ علمی برتری ان کے تعلیمی نظام کی بدولت ہے جس میں استاد کو ایک اہم مقام حاصل ہے کیونکہ یہ اساتذہ ہی ہیں جو تعلیمی عمل کو سرانجام دیتے ہیں۔ علوم وفنون، روایات واقدار، نظریات اور رویوں کو اگلی نسل تک منتقل کرنے کی اہم ذمہ داری انہی کے سپرد ہے۔ یوں بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی نظام تعلیم اپنے اساتذہ سے زیادہ بہتر نہیں ہوسکتا۔ اساتذہ جس قدر اچھے ہوں گے، مقصد سے لگن رکھتے ہوں گے، قومی نظریہ حیات پر یقین اور اعتماد رکھنے والے ہوں گے، اسی نسبت

سے وہ نظامِ تعلیم اور اس کے فارغ التحصیل افراد کامیاب اور کامران ہوں گے۔لہٰذا معاشرتی، معاشی اور نظریاتی استحکام کے پیشِ نظر ہر معاشرہ ارادی طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے افراد کی تربیت بہتر بلکہ بہترین اساتذہ کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ تعلیمی عمل کی کامیابی میں اساتذہ کے اس اہم کردار کے باعث ہر معاشرہ طلبہ کے لیے تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تربیت کے لیے بھی ادارے قائم کرتا ہے۔ پاکستان میں بھی دنیا کے دیگر ممالک کی طرح تربیت اساتذہ کے مختلف ادارے قائم ہیں جو ابتدائی اور ثانوی سطح کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:۔

1- کالجز آف ایجوکیشن (Colleges of Education)

ملک میں وفاقی اور صوبائی سطح پر ثانوی سطح کے اساتذہ کی تربیت کے لیے یہ قائم شدہ ادارے کالجز آف ایجوکیشن کہلاتے ہیں۔ وفاقی سطح پر اسلام آباد میں ایک فیڈرل کالج آف ایجوکیشن قائم ہے جب کہ صوبائی سطح پر ہر صوبے کی تعلیمی ضروریات کے مطابق یہ ادارے موجود ہیں جو قبل از ملازمت تربیت اساتذہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

پنجاب میں ان اداروں کی تعداد چھ (6) ہے جن میں سے تین ادارے لاہور میں ہیں۔ باقی تین فیصل آباد، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں قائم ہیں۔ ان میں سے ایک ادارہ صرف ثانوی سطح کے سائنس اساتذہ کی تربیت کرتا ہے۔ یہاں طلبہ و طالبات کو ایف ایس سی (F.Sc) کے بعد تین سال کے لیے داخلہ دیا جاتا ہے اور انھیں کامیاب ہونے پر بی ایس ایڈ (B.S.Ed) کی ڈگری ملتی ہے۔ دیگر تمام ادارے بھی تمام مضامین کی تدریس کے لیے ثانوی سطح کے اساتذہ کی تربیت کرتے ہیں۔ یہ سب مخلوط ہیں جب کہ ایک صرف خواتین کے لیے مخصوص ہے۔ان تمام اداروں میں ثانوی سطح کے اساتذہ کی تربیت کا بندوبست کیا گیا ہے۔

صوبہ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ان اداروں کی تعداد بالترتیب 4، 2 اور 1 ہے۔یعنی سندھ میں 4، سرحد میں 2، بلوچستان میں 1 اور اسلام آباد میں 1 ہے۔ان اداروں کو پہلے ٹیچرز ٹریننگ کالج کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں ان کو کالج آف ایجوکیشن کا نام دے دیا گیا۔ بی اے (BA) یا بی ایس سی (B.Sc) کے بعد ایک سال کے پیشہ ورانہ کورس کی تکمیل پر بی۔ایڈ کی ڈگری ملتی ہے۔ان اداروں میں ایم ایڈ (M.Ed) اور ایم اے ایجوکیشن (M.A. Education) کے پروگراموں کے اجرا سے تربیت اساتذہ کے معیار کو اور زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

صوبوں میں کالجز آف ایجوکیشن کے علاوہ پبلک یونیورسٹیوں میں بھی قبل از ملازمت تربیت اساتذہ کے انتظامات موجود ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں میں ایجوکیشن کے شعبے جب کہ کئی دوسری یونیورسٹیوں میں ادارہ ہائے تعلیم و تحقیق قائم ہیں۔ایسے تمام شعبوں اور اداروں میں بی ایڈ سے لے کر ایجوکیشن میں ایم فل (M.Phil) اور پی ایچ ڈی (Ph.D) کے پروگرام بھی جاری ہیں۔

2- گورنمنٹ کالجز برائے ایلیمنٹری ایجوکیشن
(Government Colleges for Elementary Education)

کالجز آف ایجوکیشن کی طرح وفاقی اور صوبائی سطح پر ابتدائی درجوں کے اساتذہ کی تربیت کے لیے یہ ادارے مختلف شہروں میں کام کررہے ہیں۔ گورنمنٹ کالجز برائے ایلیمنٹری ایجوکیشن اور کالجز آف ایجوکیشن میں بنیادی فرق اساتذہ کی تربیتی سطح کا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایلیمنٹری کالجز ابتدائی سطح کے اساتذہ کو قبل از ملازمت تربیت فراہم کرتے ہیں جب کہ دوسرے ادارے ثانوی سطح کے اساتذہ کی تربیت کا بندوبست کرتے ہیں۔

پہلے ان میں سے زیادہ تر ادارے نارمل سکول کہلاتے تھے جہاں پرائمری سے لے کر مڈل درجہ تک پڑھانے کے لیے اساتذہ کی تربیت ہوتی تھی۔ بعد میں ان اداروں کو ایلیمنٹری کالجز آف ایجوکیشن کا نام دے دیا گیا۔

وفاقی سطح پر فیڈرل کالج آف ایجوکیشن ہی ابتدائی سطح تک کی تعلیم کے لیے قبل از ملازمت تربیت اساتذہ کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ پنجاب میں گورنمنٹ ایلیمنٹری کالجز کی تعداد چھتیس (36) ہے۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے تین صوبوں سندھ، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے ایلیمنٹری کالجز میں پی۔ٹی۔سی (PTC)، سی۔ٹی (CT)، او۔ٹی (OT) ڈی۔ایم (DM) کے پروگرام جاری ہیں۔ بعض صوبوں میں ڈپلومہ ان ایجوکیشن (D.Ed) کا پروگرام بھی جاری ہے جو میٹرک کے بعد تین سال کا پروگرام ہے۔ ان اداروں میں جاری تمام تعلیمی پروگراموں کا دورانیہ ایک سال کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پی۔ٹی۔سی (PTC)، او۔ٹی (OT)، ڈرائنگ ماسٹر (DM) میں داخلہ میٹرک کے بعد جب کہ سی۔ٹی (CT) میں داخلہ ایف اے (FA)، ایف ایس سی (FSc) کے بعد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اساتذہ کی تربیت کے لیے چاروں صوبوں میں پراونشل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیچر ایجوکیشن بھی موجود ہیں جو ابتدائی اور ثانوی دونوں سطحوں کے لیے اساتذہ کی تربیت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ یہ ادارے دوران ملازمت بھی ابتدائی اور ثانوی سطح کے اساتذہ کی تربیت کرتے ہیں۔

2002ء سے صوبہ پنجاب میں قائم تمام چھتیس ایلیمنٹری کالجوں، چھ کالجز آف ایجوکیشن اور پراونشل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیچر ایجوکیشن کو نئی قائم شدہ یونیورسٹی آف ایجوکیشن کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ پنجاب میں ابتدائی سطح پر پڑھانے کے لیے اساتذہ کی کم از کم تعلیمی قابلیت کو سی ٹی (CT) اور پی ٹی سی (PTC) سے بڑھا کر بی ایڈ (B.Ed) کر دیا گیا ہے اس لیے پنجاب میں تربیت اساتذہ کے تمام اداروں میں پی ٹی سی (PTC) اور سی ٹی (CT) کے تربیتی پروگرام ختم کر دیے گئے ہیں اور اب یہ ادارے صرف بی ایڈ (B.Ed) کے پیشہ ورانہ پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ جب کہ کالجز آف ایجوکیشن میں ایم ایڈ (M.Ed) اور ایم اے ایجوکیشن (M.A.Education) کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ بی ایڈ (B.Ed) کے پروگرام بھی جاری ہیں۔

پنجاب کے علاوہ دیگر صوبوں میں ایلیمنٹری کالجز آف ایجوکیشن براہِ راست صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ صوبہ سندھ میں ایلیمنٹری کالجز آف ایجوکیشن کی تعداد 24 ہے جبکہ صوبہ سرحد میں ایسے 18 ادارے کام کر رہے ہیں۔ صوبہ بلوچستان میں قائم ایلیمنٹری کالجز کی تعداد 10 ہے۔ وفاقی سطح پر بھی 4 ایلیمنٹری کالجز آف ایجوکیشن خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان صوبوں میں ابتدائی سطح کے اساتذہ کی تیاری کے لیے روایتی تربیتی پروگرام جاری ہیں۔

پرائیویٹ تنظیمیں (Private Sector Organizations)

ملک بھر میں اساتذہ اور شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے افراد کی پیشہ ورانہ ترقی اور بہتری کے لیے سرکاری اداروں کے ساتھ پرائیویٹ شعبہ بھی اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ جہاں ایک طرف مختلف سطح کے اساتذہ کے لیے قبل از ملازمت اور دوران ملازمت کورسز کا انعقاد کیا جاتا ہے تو دوسری طرف تعلیمی نگرانی، جائزے اور انتظامی امور نپٹانے کے لیے بھی شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے لیے کورسز، سیمینارز اور ورکشاپس منعقد کی جاتی ہیں۔ پرائیویٹ شعبہ اس سلسلہ میں نہایت موثر انداز میں خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

تعلیمی شعبہ کے افراد کے لیے مختلف نوعیت کی تربیتی سہولتیں فراہم کرنے والے اداروں میں درج ذیل نمایاں ادارے شامل ہیں:۔

1- انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ، آغاخان یونیورسٹی کراچی
2- سکول آف ایجوکیشن بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی لاہور
3- علی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن لاہور

امتحانات
(Examinations)

سکولوں میں اساتذہ جو کچھ طلبہ کو پڑھاتے ہیں اس کا جائزہ لینے کے لیے مختلف طریقوں سے ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔ کبھی وہ کمرۂ جماعت میں زبانی سوالات کے ذریعے، کبھی کلاس ٹیسٹ کے ذریعے، کبھی گھر کا کام دے کر طلبہ کے اکتساب کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ سکولوں میں سہ ماہی، ششماہی، نوماہی اور سالانہ امتحانات کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کی کارکردگی اور اکتساب کا جائزہ لے کر ان کو نہ صرف اگلی جماعت میں ترقی دینے کا فیصلہ کیا جا سکے بلکہ ان کی کارکردگی کا باہمی موازنہ بھی کیا جا سکے۔

ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں تعلیمی ادارے قائم ہیں جو تعلیمی عمل میں حصہ لیتے ہیں جہاں لاکھوں کی تعداد میں طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ معیار تعلیم میں یکسانیت اور تمام طلبہ کو یکساں تعلیمی مواقع کی فراہمی کے لیے ضروری ہے کہ ایک ہی سطح یا درجے پر تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے ایک ہی معیار کے امتحان کا انعقاد ہو۔ سکول میں عموماً پہلی کلاس سے آٹھویں کلاس تک کا امتحان لیتے ہیں۔ پانچویں اور آٹھویں کلاس کے طلبہ وطالبات کے لیے امتحان کا انعقاد کرنا، ضلعی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی سطح پر امتحان لینے کے لیے علیحدہ امتحانی بورڈز قائم ہیں جب کہ یونیورسٹیاں اعلیٰ سطح کے تعلیمی امتحانات کے انعقاد کی ذمہ دار ہیں۔

1- فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن
(Federal Board of Intermediate & Secondary Education)

وفاقی سطح پر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے انعقاد کے لیے فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن قائم ہے۔ اس بورڈ کا دائرہ کار وفاقی دارالحکومت، اسلام آباد اور وفاق کے زیر انتظام علاقوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ بورڈ بیرونِ ملک قائم پاکستانی سکولوں اور کالجوں کے طلبہ وطالبات کے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان بھی لیتا ہے جن کا انعقاد متعلقہ ملک میں قائم پاکستانی سفارت خانے کے تعاون سے کیا جاتا ہے۔

2- صوبائی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن
(Provincial Board of Intermediate & Secondary Education)

وفاق کی طرح صوبوں میں بھی میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کے انعقاد کے لیے یہ بورڈ قائم ہیں جو اپنے دائرہ عمل (Jurisdiction) میں وہی ذمہ داریاں اور فرائض ادا کرتے ہیں جو وفاقی بورڈ اپنے علاقے میں کرتا ہے۔ صوبوں میں یہ بورڈ کالعدم انتظامی ڈویژنوں کی سطح پر قائم کیے گئے تھے۔ پنجاب میں ان بورڈوں کی تعداد آٹھ، صوبہ خیبر پختونخواہ میں چھ، صوبہ سرحد میں سات، بلوچستان میں ایک ہے۔

ہر بورڈ کی نگرانی کے لیے محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک چیئرمین کا تقرر کیا جاتا ہے۔اس کی مدد کے لیے ہر بورڈ میں ایک سیکرٹری اور ایک کنٹرولر امتحانات موجود ہوتا ہے۔ سیکرٹری بورڈ کے انتظامی امور اور کنٹرولر امتحانات امتحان سے متعلقہ معاملات کی نگرانی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یہ بورڈ امتحانات کا انعقاد کرنے کے ساتھ ساتھ ملحق اداروں میں ہم نصابی اور نصابی سرگرمیوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ طلبہ کو مختلف انعامات اور وظائف دینا بھی انہی بورڈز کی ذمہ داری ہے۔

3- فنی تعلیمی بورڈ (Board of Technical Education)

ملک میں صوبائی اور وفاقی تعلیمی امتحانی بورڈز کی طرح صوبائی سطح پر فنی تعلیم کے فروغ کے لیے فنی تعلیمی بورڈ قائم ہیں جو صوبائی محکمہ تعلیم کی زیر نگرانی کام کرتے ہیں۔

فنی تعلیمی بورڈز کا دائرہ عمل پورے صوبے تک وسیع ہوتا ہے۔ صوبے میں موجود تمام پولی ٹیکنیک (Polytechnique) اور پیشہ ورانہ (Vocational) تعلیم کے کالج، نصابی ادارے اور امتحانی معاملات میں فنی تعلیمی بورڈز سے الحاق کی منظوری لیتے ہیں۔ یہ بورڈ ڈی کام (D.Com) سی کام (C.Com) اور ڈپلومہ آف ایسوسی ایٹ انجینئر (DAE) کے نصابات کی تیاری اور امتحانات کا انعقاد کرتے ہیں۔ صوبوں میں فنی تعلیم کے فروغ کے لیے یہ بورڈ فنی تعلیم کے مختلف شعبوں اور سطحوں پر تعلیمی تحقیقات اور تدوین نصاب کا کام کرتے ہیں۔

دیگر تعلیمی بورڈوں کی طرح ان بورڈوں میں بھی چیئرمین بورڈ کے تمام معاملات کی نگرانی کرتا ہے اور اس کی مدد کے لیے سیکرٹری اور کنٹرولر امتحانات موجود ہوتے ہیں اور وہی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں جو دیگر بورڈز میں ان کے ہم منصب ادا کرتے ہیں۔ پنجاب میں فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے فروغ کے لیے ایک خود مختار اتھارٹی ٹیوٹا (TEVTA) Technical Education & Vocational Training Authority کے قیام کے بعد پنجاب میں قائم فنی تعلیمی بورڈ اب اس ادارے کا حصہ ہے۔

دیہی تعلیمی ترقی (Rural Education Development)

کسی بھی ملک کی ترقی کا معیار اس کے شہریوں کے معیار زندگی کے حوالے سے جانچا جاتا ہے آج بھی پاکستانی آبادی کی اکثریت دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ اس لیے ملکی ترقی کے جائزے میں دونوں علاقوں میں رہائش پذیر لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانا اور ان کو بنیادی ضروریات اور سہولیات زندگی فراہم کرنا ہے جس میں تعلیم، صحت، پانی، بجلی اور روزگار وغیرہ شامل ہیں۔

دیہی تعلیمی ترقی سے مراد سائنس اور ٹیکنالوجی کی نئی نئی دریافتوں اور ایجادات کو دیہی علاقوں میں استعمال کر کے ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانا ہے۔ ان علاقوں میں یہ ترقیاتی پروگرام صرف اسی وقت موثر ہو سکتا ہے جب وہاں رہنے والی آبادی تبدیلی کے عنصر (Change Agent) کا کردار ادا کرے۔

دیہی ترقی گذشتہ چند عشروں سے ہماری حکومت کی ترجیحات میں شامل ہے۔ پاکستان چونکہ ایک زرعی ملک ہے اور اس کی آبادی کا ساٹھ فی صد (60%) حصہ اب بھی دیہی علاقوں میں رہائش پذیر ہے، اس لیے کوئی بھی ترقیاتی منصوبہ صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب اس میں شہری اور دیہی دونوں علاقوں پر یکساں توجہ دی جائے۔ حکومت پاکستان نے سوشل سیکٹر ریفارم پروگرام کے تحت بہت سے نئے تعلیمی منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔

تعلیم سب کے لیے (Education for All) حکومت کا مطمع نظر ہے جس کا بنیادی مقصد خصوصاً دیہی آبادی کی تعلیمی ترقی ہے۔ صوبائی حکومتوں نے ثانوی سطح تک تعلیم مفت کر دی ہے اور تعلیمی ترقی کے لیے دیگر بہت سے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ جن میں سکولوں سے ٹاٹ سسٹم کو ختم کرنا اور فرنیچر، عمارت اور دیگر تعلیمی ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنانا شامل ہے۔ ان کے علاوہ بچوں کو درسی کتب کی مفت فراہمی اور سکولوں کو بعض معاملات میں خود مختاری دی جا رہی ہے۔

اہم نکات

1- تعلیم کے انتظام و انصرام کے لیے حکومت نے وفاقی، صوبائی اور ضلعی سطح پر مختلف ادارے قائم کیے ہیں جن میں یونیورسٹیاں، کالج، امتحانی بورڈز اور ٹیکسٹ بک بورڈز شامل ہیں۔

2- ضلعی سطح پر ضلع ناظم کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ اس کی مدد کے لیے ڈسٹرکٹ کوآرڈینیشن آفیسر (D.C.O) کا عہدہ ہے۔ تعلیمی امور کی نگرانی ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر تعلیم (E.D.O.E) کرتا ہے جس کی مدد کے لیے DEO سکولز اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

3- کالج کی تعلیم کی ذمہ داری جولائی 2006ء سے ضلعی حکومتوں سے صوبائی حکومتوں کو منتقل کر دی گئی ہے۔

4- وفاقی سطح پر قومی شعبہ تدوین نصاب وصوبائی سطح پر تدوین نصاب کے بیورو اور درسی کتب کی تیاری کے لیے صوبے کی سطح پر ٹیکسٹ بک بورڈ مصروف عمل ہیں۔ ان کے علاوہ پرائیویٹ ادارے بھی تدریسی مواد کی تیار میں حصہ لے رہے ہیں۔

5- وفاقی اور صوبائی سطح پر ثانوی سطح کے اساتذہ کی تربیت کے لیے کالجز آف ایجوکیشن اور ابتدائی درجوں کے اساتذہ کی تربیت کے لیے ایلیمنٹری کالجز آف ایجوکیشن کام کر رہے ہیں۔

6- وفاقی سطح پر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے انعقاد کے لیے فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن ہیں اور صوبائی سطح پر صوبائی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن ہیں۔ اس کے علاوہ فنی تعلیمی بورڈز بھی تعلیم کے فروغ کے لیے مصروف عمل ہیں۔

آزمائشی مشق

معروضی حصہ:

I- ہر بیان کے ساتھ دیے گئے جوابات میں سے موزوں ترین جواب پر (✓) کا نشان لگائیں:

i- یونیورسٹی سطح کی تعلیم کے فروغ اور نگرانی کے لیے قومی سطح پر قائم ادارہ ہے۔
(ا) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (ب) ہائر ایجوکیشن کمیشن
(ج) لٹریسی کمیشن (د) قومی تعلیمی کمیشن

ii- یونیورسٹیاں ایسے ادارے ہیں جو
(ا) انتظامی اور تعلیمی اعتبار سے آزاد نہیں (ب) انتظامی اور تعلیمی اعتبار سے آزاد ہیں۔
(ج) قومی اور نظریاتی امور میں آزاد ہیں۔ (د) مالی امور میں آزاد نہیں

iii- مرکزی وزارت تعلیم میں اہم انتظامی عہدہ ہے:
(ا) مرکزی وزیر تعلیم کا (ب) جوائنٹ سیکرٹری کا
(ج) وفاقی سیکرٹری کا (د) جوائنٹ ایجوکیشن ایڈوائزر کا

iv- پاکستان کے آئین کے مطابق تعلیم ذمہ داری ہے:
(ا) صوبائی حکومت کی (ب) وفاقی حکومت کی
(ج) صوبائی اور مرکزی حکومت کی (د) صوبائی اور مرکزی حکومتوں میں سے کسی کی بھی نہیں

v- صوبے میں تعلیم کے فروغ اور نگرانی کی ذمہ داری ہے:
(ا) وزارت تعلیم کی (ب) صوبائی کابینہ کی
(ج) صوبائی اسمبلی کی (د) محکمہ تعلیم کی

vi- پاکستان کے کون سے صوبے میں تین سیکرٹری تعلیم کا کام کرتے ہیں؟
(ا) پنجاب (ب) سندھ (ج) بلوچستان (د) سرحد

vii- ضلعی سطح پر تعلیمی انتظام کی ذمہ داری ہے:
(ا) ڈی سی او کی (ب) ڈی ای او تعلیم کی (ج) ڈی پی آئی کی (د) ای ڈی او تعلیم کی

viii- ضلع میں قائم پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی رجسٹریشن اور نگرانی ذمہ داری ہے:
(ا) ڈی ای او تعلیم کی (ب) ای ڈی او تعلیم کی
(ج) ڈی سی او کی (د) ضلعی ناظم کی

ix- ملک میں تدوین نصاب اور اس کی یکسانیت کام ہے:
(ا) وفاقی شعبہ تدوین نصاب کا (ب) صوبائی بیوروز تدوین نصاب کا
(ج) مشترکہ طور پر صوبائی اور وفاقی شعبہ جات نصاب کا (د) وفاقی اور صوبائی محکمہ تعلیم کا

-x درسی کتب جس ادارے کی سفارشات کے مطابق لکھی جاتی ہیں وہ کہلاتا ہے:

(ا) صوبائی شعبہ تدوین نصاب (ب) وفاقی شعبہ تدوین نصاب

(ج) ٹیکسٹ بک بورڈ (د) بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن

-xi کالجز آف ایجوکیشن اور ایلیمنٹری کالجز آف ایجوکیشن میں بنیادی فرق ہے:

(ا) اساتذہ کی تعلیمی قابلیت کا (ب) اساتذہ کی تربیتی نوعیت کا

(ج) اساتذہ کی تربیتی سطح کا (د) کوئی فرق نہیں ہے

-xii پنجاب میں ابتدائی سطح پر پڑھانے کے لیے اساتذہ کی کم از کم تعلیمی قابلیت ہونی چاہیے:

(ا) پی ٹی سی (ب) سی ٹی

(ج) ڈپلومہ آف ایجوکیشن (د) بی ایڈ

-xiii بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے ساتھ ساتھ انعقاد ہوتا ہے:

(ا) تعلیمی ورکشاپس اور کورسوں کا (ب) علاقائی لسانی امتحانات کا

(ج) تعلیمی علاقوں کے الحاق کی منظوری کا (د) ہم نصابی سرگرمیوں کا

-xiv فنی تعلیمی بورڈ کا دائرہ کار پھیلا ہوا ہے:

(ا) اپنے ضلع تک (ب) اپنے صوبے تک

(ج) ملکی حدود تک (د) بیرونی ملک میں رہنے والے پاکستانی طلبہ کے امتحانات تک

-II خالی جگہ پُر کریں۔

-i وزیر تعلیم عہدے کے اعتبار سے یونیورسٹیوں کا.................بھی ہوتا ہے

-ii نیورسٹیوں کے تعلیمی اور مالی معاملات کی نگرانی اور رہنمائی کے لیے.................قائم کیا گیا ہے۔

-iii کسی بھی صوبہ میں قائم یونیورسٹی کا چانسلر صوبے کا.................بھی ہوتا ہے۔

-iv یونیورسٹیوں بنیادی طور پر.................تعلیمی ادارے ہیں۔

-v صوبائی سطح پر تعلیمی معاملات کا انصرام واہتمام کرنا.................کی ذمہ داری ہے۔

-vi وفاقی وزارت تعلیم میں اہم ترین عہدہ.................تعلیم کا ہے۔

-vii EDO ایجوکیشن کی اصطلاح.................کا مخفف ہے۔

-viii D.P.I آفس سے مراد.................ہے۔

-ix حکومت نے صوبوں میں قائم انتظامی ڈویژن ختم کر کے یہ اختیارات ضلع اور تحصیل کی سطح پر منتقل کیے ہیں، اس منصوبے کا نام ....ہے۔

-x ضلعی سطح پر معاملات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے اہم ترین سرکاری عہدے دار کو.................کہتے ہیں۔

-xi ضلع میں عوام کے ووٹوں سے منتخب اعلیٰ ترین عہدے دار کو.................کہتے ہیں۔

-xii ضلع کی سطح پر خواندگی کو بہتر بنانے کے لیے حکومت نے.................کا تقرر کیا ہے۔

xiii- کسی بھی نظام کی کامیابی کا انحصار اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ نظام کس حد تک اپنے .... کے حصول میں کامیاب ہوتا ہے۔

III- مختصر جوابات لکھیں:

i- تعلیمی معاملات کی نگرانی اور وائس چانسلر کی مدد کے لیے قائم ہونے والے کم از کم چار اہم اداروں کے نام لکھیں۔

ii- وفاقی وزارتِ تعلیم کے کم از کم پانچ اہم شعبوں کے نام لکھیں۔

iii- وفاقی وزارتِ تعلیم کے کم از کم پانچ اہم فرائض پر نوٹ لکھیں۔

iv- صوبائی محکمہ تعلیم کے پانچ اعلیٰ اداروں/ دفاتر کی فہرست مرتب کریں۔

v- صوبائی محکمہ تعلیم کے پانچ اہم اختیارات کی فہرست تیار کریں۔

vi- صوبہ پنجاب میں تعلیم کے محکمے کی نگرانی کے لیے تین اعلیٰ ترین سرکاری عہدے کون کون سے ہیں؟ کسی ایک پر نوٹ لکھیں۔

vii- مراکز توسیع تعلیم کے کم از کم پانچ وظائف درج کریں۔

viii- قومی شعبہ تدوین نصاب کے مقاصد کی فہرست تیار کریں۔

ix- پاکستان کے نصاب تعلیم کے پانچ اہم ترین مقاصد کی فہرست تیار کریں۔

x- پاکستان میں تعلیمی نصاب اور درسی کتب کی تیاری کے لیے کام کرنے والے مختلف محکموں اور اداروں کے نام تحریر کریں۔

xi- نفاذ نصاب میں قومی اداروں کے کردار پر نوٹ لکھیں۔

IV- درج ذیل میں کالم (ا) اور کالم (ب) میں درج الفاظ میں باہمی تعلق معلوم کر کے کالم (ب) کے سامنے کالم (ج) میں مطلوبہ الفاظ درج کریں۔

کالم (ا)	کالم (ب)	کالم (ج)
1- ہائیر ایجوکیشن (HEC) دائرہ اختیارات کے اعتبار سے کس سابقہ ادارہ سے زیادہ موثر ہے؟	i- صوبائی محکمہ تعلیم	
2- صوبائی وزیر تعلیم صوبے کی تمام یونیورسٹیوں کا کہلاتا ہے۔	ii- نصاب تعلیم	
3- قومی تعلیمی پالیسی مرتب کرنا اور ملکی نظام تعلیم کی نگرانی کرنا بھی اس کی اہم ذمہ داری ہے۔	iii- یونیورسٹی گرانٹس کمشن (UGC)	
4- محکمہ تعلیم میں صوبہ کی سطح پر وزیر تعلیم کے بعد اہم ترین عہدہ دار ہوتا ہے۔	iv- ڈی۔سی۔او (DCO)	
5- ہر صوبے میں صوبے کے لیے تعلیمی بجٹ اور منصوبے تیار کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔	v- پرو چانسلر	
6- تمام اضلاع میں تمام محکموں کو کنٹرول کرنا اور ان کو موثر بنانا اس عہدہ کی ذمہ داری ہے۔	vi- صوبائی بیوروز تدوین نصاب و تحقیق	

7-صوبائی ہیڈکوارٹرز پر محکمہ تعلیم کا اعلیٰ ترین افسر کہلاتا ہے۔	vii-وفاقی وزارتِ تعلیم	
8- ضلعی سطح پر خواندگی بڑھانے کے لیے ذمہ دار افسر کہلاتا ہے۔	viii-ای۔ڈی۔او(EDO)	
9- مقاصد تعلیم کے حصول کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہے اور نظامِ تعلیم کا بنیادی عنصر ہے۔	ix-صوبائی سیکرٹری تعلیم	
10-وفاقی وزارتِ تعلیم کے مطابق نصاب تعلیم بنانا اس کو متوازن کرنا اور درجہ بندی کرنا اس کی اہم ذمہ داری ہے۔	x-ڈی۔پی۔آئی(DPI)	
	xi- ٹیکسٹ بک بورڈ	
	xii- گشتی ماڈل ٹیم	

انشائیہ حصہ

V- موجودہ ضلعی تعلیمی نظام کی خصوصیات بیان کریں۔اس نظام کے تحت ای۔ڈی۔او تعلیم کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کریں۔

VI- پاکستان میں صوبائی اور قومی سطح پر نصاب سازی کے عمل کی وضاحت کریں اور درسی کتب کی تیاری میں تدوینِ نصاب کے اداروں کے کردار کی تفصیل لکھیں۔

VII- سٹاف ڈویلپمنٹ سے کیا مراد ہے اس کی اہمیت بیان کریں۔

VIII-صوبہ پنجاب میں ابتدائی سطح کے اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں کی تفصیل لکھیں۔

IX- امتحانات کی اہمیت پر مفصل نوٹ لکھیں۔نیز اعلیٰ ثانوی سطح تک کے امتحانات کا انعقاد کرنے والے مختلف اداروں کے وظائف اور فرائض بیان کریں۔

فرہنگ (Glossary)

اساس : بنیاد

استحکام : مضبوطی

اعانت : مدد

افکار : فکر کی جمع، سوچ

افہام وتفہیم : صلح صفائی

اقامتی درسگاہ : ایسا مدرسہ جہاں رہائش بھی ہو۔

انتظام وانصرام: باگ ڈور

انقطاع : ختم کرنا

آموختہ : سبق

بالادستی : حکمرانی

بالواسطہ : کسی ذریعے سے

بلاتخصیص : بغیر کسی فرق کے

بلاواسطہ : بغیر کسی ذریعے سے

تدریجی ربط : درجہ بدرجہ تعلق

ترویج کرنا : رائج کرنا

تفاوت : فرق

حسین امتزاج : خوبصورت ملاپ

حمیت : عزت

خدوخال : شکل وصورت

درس وتدریس : تعلیم دینا

دسترس : پہنچ

ذہنی استعداد : دماغی صلاحیتیں

رزیلہ : برا

روبہ تنزل : پستی کی طرف

سخت گیر : ظالم

سینہ بہ سینہ : ایک شخص سے دوسرے تک

شرعی حرمت : شرعاً حرام

صاحب ثروت: دولت مند، امیر

غلبہ اور تسلط : چھا جانا، قبضہ کرنا۔

فکر انگیز : سوچ کو بڑھانے والی

فوقیت : بڑائی، عظمت

کفالت : دیکھ بھال

کلی طور پر : مکمل طور پر

کہانت : پیشن گوئی کرنا

گہوارہ : جھولا

لائحہ عمل : طریق کار

متصادم : ٹکراؤ

متعصبانہ : تنگ نظری

مداخلت : دخل اندازی

مرقع : تصویر

مطمع نظر : نقطۂ نظر، لُب لباب

معقولات : عقلی علوم

ملکہ حاصل کرنا : ہنر میں کمال حاصل کرنا

منفی عدم مساوات: برابری نہ ہونا

منقولات : نقلی علوم

ناروا : برا

نشاۃِ ثانیہ : دوسری زندگی

نظریات : نظریہ کی جمع، خیال، سوچ

نیابت الٰہی : خلافت

وافر : زیادہ

ہم رنگی، یکسانیت: ایک جیسا ہونا

یلغار : حملہ

کتابیات (Bibliography)

-1 اکبر علی، خواجہ نذیر احمد، پاکستان میں تعلیم کی تاریخ، لاہور، مجید بک ڈپو

-2 ایجوکیشن سیکٹر پالیسی پیپرز، تھرڈ ایڈیشن، ورلڈ بنک

-3 آکسفورڈ، 2002ء، ہیومن ڈویلپمنٹ ان ساؤتھ ایشیا محبوب الحق ہیومن ڈویلپمنٹ سنٹر

-4 بنکاک، 2000ء، ''ایجوکیشن فار آل''، یونیسکو

-5 پرل جانسن اور ہیز رراتف، تعلیم اور معاشی ترقی، اسلام آباد، ای پی ایم کورس علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

-6 تعلیم اور کام پرسپکٹس رپورٹ یونیسکو

-7 حکومت پاکستان، اکنامک سروے آف پاکستان 05-2004ء، اسلام آباد، فنانس ڈویژن

-8 حکومت پاکستان، ایجوکیشن سیکٹر ریفارمز 04-2001ء، اسلام آباد، وزارت تعلیم

-9 حکومت پاکستان، تعلیمی پالیسیاں اور تعلیمی منصوبے، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز

-10 حکومت پاکستان، نیشنل پلان، اسلام آباد، وزارت تعلیم

-11 حکومت پاکستان، تعلیم آبادیات، اسلام آبا، دوزارت تعلیم تعلیم آبادیات سیل شعبہ نصابیات

-12 حکومت پنجاب، 2003ء، پنجاب ایجوکیشن سناریو، لاہور، پنجاب ایس سنٹر

-13 خالد یار خاں، تقابلی تاریخ، کراچی، کفایت اکیڈمی

-14 خضر اقبال راجہ، 1990ء، تعلیم اور فکر اسلامی، لاہور، مجید بک ڈپو

-15 ایس ایم اختر، پاکستان کی معاشی ترقی۔ لاہور، پبلشرز یونائیٹڈ

-16 سید عبد القادر، محمد شجاع الدین، تاریخ پاک وہند، لاہور، حق برادران

-17 عبد الرشید ارشد، 1994ء، پاکستان میں تعلیم کا ارتقا، لاہور، ادارہ تعلیمی تحقیق

-18 عبد الرشید ارشد، 1994ء، تعلیمی پالیسیاں اور اصلاح کی تجاویز، لاہور، ادارہ تعلیمی تحقیق

-19 ماہنامہ افکار معلم، لاہور، تنظیم منزل بہاول شیر روڈ

-20 محمد سرور، 1971ء، ارمغان شاہ ولی اللہ، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ

-21 محمد عیسیٰ خاں، 1997ء، تعلیمی فلسفہ اور تاریخ، لاہور، علمی کتاب خانہ

-22 مسلم سجاد، پاکستان میں نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کی حکمت عملی، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز

-23 مسلم سجاد، 1997ء، اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز

-24 نیاز عرفان، 1994ء، قومی تعلیمی پالیسیاں تقابلی جائزہ، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز

-25 ''تعلیم''، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز

S.Chand & Co.VD Mahajan, R.R. Sethi, India since 1926 -26

Situation analysis user survery ", Islamabad, Natural Institute of Pakistan -27

Govt. of Pakistan, Islamabad, Economic Survey of Pakistan 2013-14 -28